
تلاشِ وُجود
از قلم
شایان جمیل
(خودی کا مسافر)

تلاشِ وجود

خودی کے آئینے میں ایک باطنی سفر

تحریر: شایان جمیل

(خودی کا مسافر)

کاپی رائٹ صفحہ

پہلا ایڈیشن: 29:12:2025

تحریر: شـــایـــان جمـــیـــل

قلمی نام: خـــودی کـــا مســـافر

.

انتساب

یہ کتاب ان بےنام روحوں کے نام
جو ہجوم میں رہ کر بھی
اپنے اندر کی تنہائی سے واقف ہیں۔
ان آنکھوں کے نام
جو نیند سے زیادہ سچائی کی تلاش میں جاگتی رہیں۔
ان دلوں کے نام
جو ٹوٹ کر بھی اپنے وجود کی کرچیاں سمیٹتے رہے۔
اور اُس مسافر کے نام
جو آئینے کے سامنے کھڑا ہو کر یہ سوال پوچھنے کی ہمت کرتا ہے:
"میں کون ہوں؟"
یہ کتاب اُن سب کے نام
جو خود کو کھو کر خود کو پانے نکلے ہیں۔

تشکر

میں سب سے پہلے اپنے والدین کے حضور سرِ تسلیم خم کرتا ہوں۔ انہوں نے مجھے صرف زندگی نہیں، یقین دیا۔ جب راستے تنگ ہوئے، ان کی دعاؤں نے وسعت پیدا کی۔ میری تحریر میں اگر کوئی سچ ہے تو وہ انہی کی تربیت کا عکس ہے۔ تعلیمی سفر میں ہر جگہ حوصلہ نہیں ملا۔ کچھ اساتذہ نے خواب کو غیر عملی کہا، کچھ نے شوق کو وقتی جذبہ سمجھا۔ دوستوں کی محفلوں میں میرا قلم مذاق بھی بنا، مگر میں نے سیکھ لیا کہ ہر آواز سہارا نہیں ہوتی کچھ آوازیں انسان کو مضبوط بنانے آتی ہیں۔

میری رہنمائی اور حوصلہ افزائی کے لیے سب سے زیادہ شکر گزار ہوں میاں جنید خان صاحب کے حضور، جنہوں نے مجھے دوست، استاد اور مشعلِ راہ سب کچھ بنایا۔ آپ کی بصیرت اور علم نے میرے خیالات کو شکل دی اور میرا سفر ممکن بنایا۔ آپ کی رہنمائی کے بغیر یہ تحریر کبھی مکمل نہ ہوتی۔ ہر قدم پر آپ کی نصیحت اور حمایت نے مجھے مضبوط رکھایہ تحریر اور میری کامیابی آپ کی محنت اور رہنمائی کا ثبوت ہے، میاں جنید خان صاحب۔

اس سفر میں ایک نام روشنی کی طرح ساتھ رہا میری تنہائی۔ جب باقی سوال تھے، وہ یقین تھا۔ جب سب نے ہنسی اڑائی، اس نے اعتبار کیا۔ اس نے میرے لفظوں کو شوق نہیں، ذمہ داری سمجھا۔ میں اپنے والدین کا ممنون ہوں کہ انہوں نے بنیاد رکھی، اور اپنی تنہ کا شکر گزار ہوں کہ اس نے اس بنیاد پر اعتماد قائم رکھا۔ یہ کتاب سہولت کی پیداوار نہیں، ثابت قدمی کی گواہی ہے اور اس گواہی میں میرے والدین کی دعائیں اور میری تنہائی کا یقین ہمیشہ شامل رہے گا۔

پیش لفظ

یہ کتاب ایک سوال سے شروع ہوئی اور شاید آپ کے اندر ایک نیا سوال جگا کر ختم ہو۔

میں نے کبھی مصنف بننے کا خواب نہیں دیکھا تھا۔ میں صرف خود کو سمجھنا چاہتا تھا۔ زندگی چلتی رہی لوگ آتے گئے، بچھڑتے گئے؛ کامیابیاں شور بنیں اور ناکامیاں خاموش زخم۔

پھر ایک دن میں نے خود سے پوچھا:

کیا میں وہی ہوں جو دنیا دیکھتی ہے؟

یا وہ بھی جو میں خاموشی میں محسوس کرتا ہوں؟

یہی سوال "تلاشِ وجود" کی پہلی سطر بنا۔

یہ کتاب کسی فلسفے کی تبلیغ نہیں، نہ کسی مکتبِ فکر کا اعلان۔ یہ ایک باطن کی روداد ہے کھو جانے سے سنبھلنے تک، ٹوٹنے سے سمجھنے تک، اور سمجھنے سے قبول کرنے تک۔ یہ دلیل نہیں دیتی، آئینہ دیتی ہے۔

میں کامل نہیں۔ میں نے غلطیاں کیں، خوف سے گزرا اور کبھی دوسروں کی رائے میں خود کو ڈھونڈتا رہا۔ مگر جب میں نے رک کر اپنے اندر دیکھنے کی ہمت کیوہی لمحہ اس کتاب کی اصل ابتدا تھا

خودی کا مسافر — ایک تعارف نہیں، ایک سفر

میں نے قلم اس لیے نہیں اٹھایا کہ مجھے پہچانا جائے۔ میں نے قلم اس لیے اٹھایا کہ میں خود کو پہچان سکوں۔ میرے اندر کچھ سوال تھے جو خاموشی میں دفن نہیں ہو رہے تھے۔ میں نے انہیں لفظ دیےاور وہی لفظ میرا راستہ بن گئے۔

میں مصنف نہیں، ایک متلاشی ہوں۔ میں نے زندگی کو قریب سے دیکھا ہے اس کی چمک بھی، اس کی چبھَن بھی۔ میں نے محسوس کیا کہ انسان سب کچھ پا کر بھی خالی رہ سکتا ہے، اور سب کچھ کھو کر بھی بیدار ہو سکتا ہے۔ اسی بیداری کی طلب نے مجھے لکھنے پر مجبور کیا۔

"خودی کا مسافر" کوئی لقب نہیں، میرا اعتراف ہے۔ میں سفر میں ہوں اپنے اندر کی طرف۔ میں نے جان لیا کہ سب سے مشکل راستہ وہ ہوتا ہے جو باہر نہیں، اندر جاتا ہے۔ میں نے اسی راستے کو چنا۔

"تلاشِ وجود" میرے لیے کتاب نہیں، ایک مرحلہ ہے۔ یہ میرے سوالوں کی گواہی ہے، میری ٹھوکروں کا اعتراف

ہے، اور اُن لمحوں کی سچائی ہے جب میں نے آئینے میں خود کو دیکھا اور نظریں نہیں چرائیں۔

میں کامل نہیں۔ میں نے خوف دیکھا، کمزوری جھیلی، اور کبھی دوسروں کی آنکھوں میں اپنی پہچان تلاش کرتا رہا۔ مگر میں نے سیکھ لیا کہ انسان کی اصل طاقت بے خطا ہونے میں نہیں، سچ کا سامنا کرنے میں ہے۔

میرا یقین سادہ ہے:

انسان مکمل نہیں ہوتا، مگر بیدار ہو سکتا ہے۔

اور جب وہ بیدار ہو جائے تو اس کی زندگی محض گزرتی نہیں اثر چھوڑتی ہے۔ اگر میرے لفظ کسی ایک روح کو بھی اپنے اندر جھانکنے پر مجبور کر دیں، تو میرا سفر رائیگاں نہیں۔

میں اب بھی مسافر ہوں.اور میرا راستہ ابھی ختم نہیں ہوا۔

شایان جمیل

(خودی کا مسافر)

فہرستِ مضامین

حصہ اوّل: کھو جانا

حصہ دوم: ٹوٹ جانا

حصہ سوم: پا لینا

حصہ اوّل: کھو جانا

حصہ اوّل: کھو جانا

باب اوّل: بھیڑ میں گم نام

جب اردگرد سب ہوں مگر انسان خود سے غائب ہو جائے

میں بھیڑ میں کھڑا تھا مگر خود سے دور تھا
سب نے مجھے پہچانا، بس میں ہی بے شعور تھا
میں سب کے ساتھ چلتا رہا، مگر راستہ میرا نہ تھا
نام میرا تھا مگر فیصلہ میرا نہ تھا۔

بھیڑ عجیب چیز ہوتی ہے۔ وہ تمہیں تنہا بھی نہیں چھوڑتی اور تمہیں خود بھی نہیں رہنے دیتی۔ تم اس کا حصہ بنتے ہو تو وہ تمہیں اپنی رفتار، اپنے انداز اور اپنے فیصلوں میں ڈھالنے لگتی ہے۔ شروع میں یہ سب معمولی لگتا ہے۔ تم سوچتے ہو کہ سب ایسے ہی کرتے ہیں، سب ایسے ہی بولتے ہیں، سب ایسے ہی جیتے ہیں۔

مگر آہستہ آہستہ تمہاری اپنی آواز دھیمی پڑنے لگتی ہے۔ تم خود سے زیادہ دوسروں کو سننے لگتے ہو۔ تمہارے فیصلے تمہارے نہیں رہتے، وہ ماحول کے ہو جاتے ہیں۔

میں نے بھی یہی کیا۔ میں نے کبھی کھل کر یہ سوچنے کی کوشش نہیں کی کہ میں اصل میں کیا چاہتا ہوں۔ میں نے دیکھا کہ لوگ کن چیزوں کو پسند کرتے ہیں، کن باتوں پر تالیاں بجاتے ہیں، کن چہروں کو قبول کرتے ہیں۔ پھر میں نے ویسا بننے کی کوشش کی۔ میں نے اپنی باتوں کو بدلا، اپنے شوق چھپائے، اپنے سوال دبائے۔ میں نے سوچا کہ اگر میں سب جیسا ہو جاؤں گا تو مجھے بھی قبول کر لیا جائے گا۔

قبولیت کا لالچ بہت خاموشی سے انسان کو بدل دیتا ہے۔ وہ تم سے کہتا ہے کہ تھوڑا سا خود کو بدل لو، تھوڑا سا سمجھوتہ کر لو، تھوڑا سا خاموش رہ لو۔ تم سمجھتے ہو کہ یہ وقتی ہے۔ مگر یہی وقتی تبدیلیاں مستقل عادت بن جاتی ہیں۔ ایک دن تم آئینے میں خود کو دیکھتے ہو اور محسوس کرتے ہو کہ تم وہ نہیں رہے جو کبھی تھے۔ تم کسی اور کا بہتر ورژن بننے کی کوشش میں اپنا اصل ورژن کھو بیٹھتے ہو۔

بھیڑ میں گم ہونا شور سے نہیں ہوتا، تقلید سے ہوتا ہے۔ جب تم ہر بات پر یہ سوچنے لگو کہ لوگ کیا کہیں گے، تب تمہاری اصل رائے پیچھے ہٹ جاتی ہے۔ جب تم ہر فیصلے

سے پہلے یہ دیکھو کہ سب کیا کر رہے ہیں، تب تمہارا راستہ تمہارا نہیں رہتا۔ تم صرف ہجوم کی سمت میں بہتے رہتے ہو۔

ایک وقت تھا جب میں نے اپنی پسندیدہ چیزیں چھوڑ دیں صرف اس لیے کہ وہ عام نہیں تھیں۔ مجھے کچھ موضوعات پسند تھے، کچھ کتابیں اچھی لگتی تھیں، کچھ خیالات میرے اندر ہلچل مچاتے تھے۔ مگر جب میں نے دیکھا کہ میرے اردگرد لوگ انہیں اہم نہیں سمجھتے، تو میں نے بھی انہیں غیر اہم مان لیا۔ میں نے اپنے شوق کو سنجیدگی سے لینا چھوڑ دیا۔ میں نے اپنی دلچسپیوں کو مذاق میں اڑا دیا تاکہ کوئی اور ان پر سوال نہ کرے۔

مجھے یاد ہے ایک دن کلاس میں سب اپنے اپنے مستقبل کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ کوئی انجینئر بننا چاہتا تھا، کوئی ڈاکٹر، کوئی بزنس مین۔ جب میری باری آئی تو میں نے وہی کہا جو سب سننا چاہتے تھے۔ میں نے وہ جواب دیا جو محفوظ تھا، جو قابلِ قبول تھا۔ مگر اندر ایک ہلکی سی چبھن ہوئی۔ میں جانتا تھا کہ وہ میرا جواب نہیں تھا۔ وہ ایک تیار شدہ جملہ تھا، جو میں نے صرف اس لیے کہا تاکہ میں مختلف نہ لگوں۔

وہ دن شاید معمولی تھا، مگر میرے لیے اہم تھا۔ کیونکہ اسی دن مجھے پہلی بار محسوس ہوا کہ میں خود سے سچ نہیں بول رہا۔ میں دوسروں کے سامنے ایک تصویر پیش کر رہا ہوں، مگر اندر کچھ اور ہے۔ اس فرق نے مجھے بے چین کیا۔ میں نے اسے نظر انداز کرنے کی کوشش کی، مگر وہ سوال بار بار لوٹ کر آتا رہا: اگر تم اپنی بات بھی نہیں کہہ سکتے تو پھر تم ہو کون؟

بھیڑ میں رہنا آسان ہے۔ وہاں تمہیں زیادہ سوچنا نہیں پڑتا۔ تم صرف دیکھتے ہو کہ اکثریت کیا کر رہی ہے اور وہی دہرا دیتے ہو۔ مگر اس آسانی کی قیمت ہوتی ہے۔ تم اپنی انفرادیت کھو دیتے ہو۔ تم آہستہ آہستہ وہی بن جاتے ہو جو سب ہیں۔ اور شاید سب بھی یہی کر رہے ہوتے ہیں۔ یوں سب ایک دوسرے کی نقل میں گم ہو جاتے ہیں۔

ہمیں بچپن سے سکھایا جاتا ہے کہ اچھے بنو، سب کو خوش رکھو، کسی سے اختلاف نہ کرو۔ مگر یہ کم سکھایا جاتا ہے کہ اپنے دل کی سنو، اپنی رائے رکھو، اور اگر ضرورت ہو تو اکیلے کھڑے ہو جاؤ۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم ہجوم میں تو شامل ہو جاتے ہیں، مگر اپنی شناخت واضح نہیں کر پاتے۔

میں نے محسوس کیا کہ میں ہر جگہ موجود تھا، مگر کہیں بھی مکمل نہیں تھا۔ دوستوں کے ساتھ میں ایک انداز اپناتا، گھر میں دوسرا، اساتذہ کے سامنے تیسرا۔ ہر جگہ ایک الگ چہرہ۔ شروع میں یہ لچک لگتی تھی، مگر بعد میں یہی بوجھ بن گئی۔ کیونکہ اتنے چہرے سنبھالنا آسان نہیں ہوتا۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ ان سب چہروں کے بیچ اصل چہرہ کہیں چھپ گیا تھا۔

ایک شام میں اکیلا بیٹھا تھا۔ موبائل خاموش تھا، کمرہ بھی۔ اس خاموشی میں پہلی بار میں نے خود سے سوال کیا کہ اگر سب لوگ اپنی رائے دینا چھوڑ دیں، اگر کوئی مجھے نہ دیکھے، نہ پرکھے، نہ سراہے، تو میں کیا کرنا چاہوں گا؟ جواب فوری نہیں آیا۔ اور یہی بات مجھے ڈرا گئی۔ مجھے اپنے بارے میں اتنی سادہ بات کا جواب بھی معلوم نہیں تھا۔

یہی بھیڑ میں گم ہونا ہے۔ جب تم اپنے بارے میں بنیادی سوال کا جواب نہ دے سکو۔ جب تمہاری پہچان دوسروں کے تعارف پر منحصر ہو۔ جب تم خود کو اس نظر سے دیکھنے لگو جس سے دنیا تمہیں دیکھتی ہے۔

میں نے اس کے بعد آہستہ آہستہ چھوٹی چھوٹی چیزوں میں خود کو آزمانا شروع کیا۔ کبھی اپنی اصل رائے دی، چاہے وہ مختلف تھی۔ کبھی اپنے شوق کا دفاع کیا، چاہے کوئی ہنس پڑا۔ کبھی خاموشی اختیار کی جب سب بول رہے تھے، صرف اس لیے کہ میں واقعی کچھ کہنا نہیں چاہتا تھا۔ یہ سب آسان نہیں تھا۔ دل دھڑکتا تھا، ڈر لگتا تھا کہ لوگ کیا سوچیں گے۔ مگر ہر بار جب میں نے سچ بولا، اندر ایک ہلکا سا سکون محسوس ہوا۔

مجھے سمجھ آنے لگا کہ قبولیت سے زیادہ ضروری خود سے سچائی ہے۔ اگر میں سب کو خوش کر بھی لوں مگر خود سے مطمئن نہ ہوں تو وہ خوشی عارضی ہے۔ بھیڑ کی تعریف وقتی ہے، مگر اپنی نظر میں گر جانا دیرپا ہوتا ہے۔

یہ باب کسی اور کی شکایت نہیں، میری اپنی کمزوری کا اعتراف ہے۔ میں بھی ہجوم کا حصہ بنا، میں نے بھی اپنی آواز دبائی، میں نے بھی محفوظ راستہ چنا۔ مگر شاید گم ہونا بھی ضروری تھا تاکہ تلاش شروع ہو سکے۔ اگر میں کبھی کھوتا ہی نہ تو شاید میں خود کو ڈھونڈنے کی کوشش بھی نہ کرتا۔

بھیڑ میں گم نام ہونا انجام نہیں، ایک مرحلہ ہے۔ مسئلہ یہ نہیں کہ تم بھیڑ میں ہو، مسئلہ یہ ہے کہ تم اس میں خود کو بھول نہ جاؤ۔ تم مختلف ہو سکتے ہو، خاموش ہو سکتے ہو، کم مقبول ہو سکتے ہو، مگر اگر تم اپنے ساتھ سچے ہو تو تم گم نہیں ہو۔

سفر کی شروعات یہی ہے کہ انسان مان لے کہ وہ کھو گیا تھا۔ جب تک ہم خود کو مکمل سمجھتے رہتے ہیں، ہم تلاش نہیں کرتے۔ مگر جیسے ہی ہمیں اپنی گمشدگی کا احساس ہوتا ہے، ایک نئی راہ کھلتی ہے۔

شاید "تلاشِ وجود" کا پہلا قدم یہی ہے کہ ہم ہجوم سے نفرت نہ کریں، مگر اس کے غلام بھی نہ بنیں۔ ہم لوگوں کے ساتھ چلیں، مگر آنکھیں بند کر کے نہیں۔ ہم سیکھیں، مگر اپنی پہچان کی قیمت پر نہیں۔

کیونکہ آخر میں سوال یہی رہ جاتا ہے: اگر سب لوگ تمہیں جانتے ہوں مگر تم خود کو نہ جانتے ہو، تو کیا تم واقعی موجود ہو؟ اور اگر ایک دن تم نے خود کو پا لیا، تو شاید تمہیں بھیڑ سے نکلنے کی ضرورت بھی نہ پڑے، تم اسی میں رہ کر بھی الگ نظر آؤ گے۔

کھو جانا کمزوری نہیں، بے خبری ہے۔ اور جیسے ہی انسان کو اپنی بے خبری کا علم ہو جائے، واپسی شروع ہو جاتی ہے۔ یہ واپسی شور سے نہیں، ایک خاموش اعتراف سے شروع ہوتی ہے کہ ہاں، میں بھیڑ میں تھا، مگر اب میں خود کو ڈھونڈنا چاہتا ہوں۔ یہی تلاش آگے چل کر شناخت بنے گی، اور یہی شناخت ایک دن سکون دے گی۔

حصہ اوّل: کھو جانا

باب دوم: آئینے پر دھند

جب چہرہ سامنے ہو مگر پہچان دھندلا جائے

آئینہ کچھ نہ بولا، سب فیصلہ نظر نے کیا
میں خود سے دور تھا ورنہ دھند کا گھر نہ تھا۔

آئینہ ہمیشہ دیوار پر ٹنگا رہتا ہے، مگر اصل آئینہ انسان کے اندر ہوتا ہے۔ باہر والا آئینہ صرف شکل دکھاتا ہے، اندر والا حقیقت دکھاتا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہم باہر والے آئینے کے سامنے زیادہ وقت گزارتے ہیں اور اندر والے سے نظریں چرا لیتے ہیں۔ ہم بال درست کرتے ہیں، مسکراہٹ ترتیب دیتے ہیں، کپڑے سنوارتے ہیں، مگر اپنے ارادوں، نیتوں اور خوف کو نہیں ٹٹولتے۔ یوں آہستہ آہستہ تصویر تو صاف رہتی ہے مگر پہچان دھندلا جاتی ہے۔

کھو جانے کا دوسرا مرحلہ یہی ہے کہ انسان خود کو دیکھتا تو ہے مگر پہچان نہیں پاتا۔ اسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کیا دکھائی دے رہا ہے، مگر یہ یقین نہیں ہوتا کہ وہی اصل ہے۔ وہ دوسروں کی توقعات کے مطابق اپنے خدوخال بناتا رہتا

ہے۔ اگر اسے سنجیدہ سمجھا جائے تو وہ سنجیدگی اوڑھ لیتا ہے، اگر اسے خوش مزاج کہا جائے تو وہ ہر حال میں ہنسنے لگتا ہے۔ آہستہ آہستہ وہ تعریفوں کے مطابق ڈھلنے لگتا ہے، سچ کے مطابق نہیں۔

میں نے بھی ایک وقت کے بعد یہی کیا۔ جب کسی نے کہا کہ تم مضبوط ہو، تو میں نے کمزوری چھپا لی۔ جب کسی نے کہا کہ تم سمجھدار ہو، تو میں نے سوال پوچھنا کم کر دیا تاکہ یہ تاثر قائم رہے۔ میں نے ایک کردار سنبھال لیا اور اسے نبھانے لگا۔ شروع میں یہ سب تعریف جیسا لگا، مگر پھر یہ ذمہ داری بن گئی۔ مجھے ہر حال میں وہی رہنا تھا جو لوگ سمجھتے تھے۔ اس کوشش میں میں یہ بھول گیا کہ میں اصل میں کیا ہوں۔

دھند اچانک نہیں اترتی، وہ سانس کی طرح آہستہ آہستہ جمتی ہے۔ ہر وہ لمحہ جب تم دل کی بات روک لیتے ہو، ہر وہ موقع جب تم اپنی رائے بدل دیتے ہو صرف اس لیے کہ تمہیں الگ نہ سمجھا جائے، وہ سب دھند کی ایک اور تہہ بن جاتا ہے۔ پھر ایک دن تصویر دھندلی ہو جاتی ہے اور تمہیں لگتا ہے کہ مسئلہ روشنی کا ہے، حالانکہ مسئلہ شیشے پر جمی پرت کا ہوتا ہے۔

مجھے یاد ہے ایک دن اسکول سے واپسی پر میں سیدھا کمرے میں گیا اور آئینے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ کوئی خاص وجہ نہیں تھی، بس دل میں ایک عجیب سی بے چینی تھی۔ میں نے خود کو غور سے دیکھا۔ چہرہ ویسا ہی تھا جیسا ہمیشہ ہوتا ہے، مگر آنکھوں میں وہ چمک نہیں تھی جو کبھی ہوا کرتی تھی۔ میں نے خود سے پوچھا کہ کیا میں واقعی خوش ہوں؟ جواب فوری نہیں آیا۔ میں نے دوبارہ سوال کیا کہ کیا میں وہی بن رہا ہوں جو میں بننا چاہتا تھا؟ اس بار بھی خاموشی ملی۔ وہ خاموشی سب سے زیادہ خوفناک تھی۔

میں نے محسوس کیا کہ میں دوسروں کی نظروں میں واضح تھا مگر اپنی نظر میں مبہم۔ سب کو معلوم تھا کہ میں کیسا ہوں، مگر مجھے خود یقین نہیں تھا۔ میں نے اپنے لیے جو راستہ چنا تھا وہ محفوظ ضرور تھا، مگر کیا وہ میرا تھا؟ میں نے جو باتیں اختیار کی تھیں وہ مقبول ضرور تھیں، مگر کیا وہ سچی تھیں؟ یہ سوال آسان نہیں تھے، مگر ان سے بھاگنا اب ممکن نہیں تھا۔

انسان جب خود سے نظریں چراتا ہے تو وقتی سکون ملتا ہے، مگر مستقل بے چینی ساتھ رہتی ہے۔ میں بھی مصروف رہنے

لگا تاکہ سوچ نہ سکوں۔ میں نے خود کو کاموں میں الجھا لیا، گفتگوؤں میں شامل رکھا، ہنسی میں چھپا لیا۔ مگر جیسے ہی میں اکیلا ہوتا، وہی سوال لوٹ آتے۔ آئینہ پھر سامنے آ جاتا، اور دھند پھر دکھائی دینے لگتی۔

ایک واقعہ مجھے آج بھی یاد ہے۔ ایک مقابلہ تھا جس میں مجھے حصہ لینا تھا۔ دل چاہتا تھا کہ میں اپنی مرضی کا موضوع چنوں، مگر مجھے مشورہ دیا گیا کہ فلاں موضوع زیادہ محفوظ ہے، اس میں جیتنے کے امکانات زیادہ ہیں۔ میں نے اپنی خواہش چھوڑ دی اور وہی منتخب کیا جو سب نے بہتر سمجھا۔ میں جیت گیا۔ سب نے مبارکباد دی۔ مگر اس رات جب میں اکیلا تھا تو مجھے خوشی محسوس نہیں ہوئی۔ میں نے کامیابی حاصل کی تھی، مگر اپنی سچائی کھو دی تھی۔ وہ پہلی جیت تھی جس نے مجھے اندر سے ہارا ہوا محسوس کروایا۔

اسی دن مجھے سمجھ آیا کہ دھند صرف کمزوری سے نہیں بنتی، بعض اوقات کامیابی سے بھی بنتی ہے۔ جب تم وہ پا لیتے ہو جو دنیا چاہتی ہے، مگر وہ نہیں جو تم چاہتے ہو، تو تصویر اور بھی دھندلا جاتی ہے۔ کیونکہ اب تمہارے پاس جواز بھی ہوتا ہے کہ سب ٹھیک ہے۔

آئینہ صاف کرنے کے لیے ہمت چاہیے۔ سب سے پہلے یہ ماننا پڑتا ہے کہ ہاں، تصویر واضح نہیں ہے۔ میں نے بھی یہ اعتراف کرنے میں وقت لیا۔ میں خود کو یہ یقین دلاتا رہا کہ سب نارمل ہے، ہر کوئی ایسا ہی کرتا ہے۔ مگر دل جانتا تھا کہ میں اپنے معیار پر پورا نہیں اتر رہا۔ میں دوسروں کے معیار پر پورا اترنے کی کوشش میں خود سے دور ہو رہا تھا۔

میں نے آہستہ آہستہ چھوٹے فیصلوں میں سچ کو ترجیح دینا شروع کیا۔ اگر مجھے کسی بات سے اختلاف ہوتا تو میں نرمی سے اپنی رائے رکھتا۔ اگر مجھے کسی راستے پر شک ہوتا تو میں رک کر سوچتا۔ میں نے یہ بھی قبول کیا کہ مجھے ہر وقت مضبوط دکھائی دینے کی ضرورت نہیں۔ میں غلط ہو سکتا ہوں، میں الجھ سکتا ہوں، اور یہ سب انسانی ہے۔

جیسے جیسے میں نے خود سے ایمانداری برتنی شروع کی، آئینہ تھوڑا صاف ہونے لگا۔ تصویر مکمل نہیں ہوئی، مگر پہچان واضح ہونے لگی۔ میں نے جانا کہ اصل مسئلہ لوگوں کی رائے نہیں تھی، مسئلہ میرا خوف تھا۔ میں ڈرتا تھا کہ اگر میں مختلف ہوا تو شاید قبول نہ کیا جاؤں۔ مگر میں یہ بھول

گیا تھا کہ اگر میں خود نہ رہا تو قبول کیے جانے کا فائدہ بھی کیا؟

آئینہ ہمیں ہماری کمزوریاں بھی دکھاتا ہے۔ اور کمزوری دیکھنا آسان نہیں ہوتا۔ مگر شاید یہی پہلا قدم ہے۔ جب تک ہم اپنی خامیوں کو تسلیم نہیں کرتے، ہم خود کو بہتر نہیں بنا سکتے۔ دھند ہٹانے کا مطلب یہ نہیں کہ تصویر کامل ہو جائے گی، بلکہ یہ ہے کہ تصویر سچی ہو جائے گی۔

کھو جانے کے بعد انسان کو سب سے پہلے خود کو دیکھنا پڑتا ہے۔ بغیر بہانے کے، بغیر دفاع کے۔ یہ کہنا پڑتا ہے کہ ہاں، میں نے سمجھوتے کیے، میں نے ڈر کو خود پر حاوی ہونے دیا، میں نے خود کو دوسروں کی نظر سے دیکھنے کی عادت بنا لی۔ مگر یہ اعتراف ہی واپسی کا آغاز ہے۔

آج بھی میں مکمل واضح نہیں ہوں۔ آئینہ کبھی مکمل صاف نہیں رہتا، اس پر وقت کے ساتھ نشان پڑتے رہتے ہیں۔ مگر اب فرق یہ ہے کہ میں انہیں دیکھ کر انکار نہیں کرتا۔ میں انہیں صاف کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ

پہچان کوئی ایک بار ملنے والی چیز نہیں، یہ مسلسل سنوارنے کا عمل ہے۔

شاید اس باب کا حاصل یہی ہے کہ ہم آئینے سے ڈریں نہیں۔ اگر تصویر دھندلی ہے تو روشنی کو کوسنے کے بجائے شیشے کو صاف کریں۔ اگر آنکھوں میں تھکن ہے تو مسکراہٹ بڑھانے کے بجائے وجہ تلاش کریں۔ کیونکہ آخرکار ہمیں اپنی ہی نظروں میں جینا ہے۔

اگر دنیا تمہیں پہچانتی ہو مگر تم خود کو نہ پہچانو تو یہ ادھورا وجود ہے۔ اور اگر تم خود کو پہچان لو، چاہے دنیا کو وقت لگے، تو یہ مکمل ہونے کی ابتدا ہے۔ دھند ہمیشہ نہیں رہتی، مگر اسے ہٹانے کے لیے سچ کی جرأت ضروری ہے۔ میں نے دیر سے سہی، مگر یہ جرأت سیکھنی شروع کر دی ہے۔ شاید یہی تلاش کا اگلا قدم ہے، جہاں چہرہ وہی رہتا ہے مگر پہچان نئی ہو جاتی ہے۔

حصہ اوّل: کھو جانا

باب سوم: تالیوں کا شور، اندر کی خاموشی

جب دنیا تمہیں کامیاب کہے مگر دل فیصلہ محفوظ رکھ لے

شور نے مجھے سرِ عام معتبر کر دیا،

خاموشی نے تنہائی میں بے نقاب کر دیا۔

کامیابی کی آواز ہوتی ہے۔ وہ سنائی دیتی ہے۔ وہ تالیاں بن کر گونجتی ہے، مبارکباد بن کر پھیلتی ہے، نام بن کر دہرائی جاتی ہے۔ مگر اطمینان کی کوئی آواز نہیں ہوتی۔ وہ اندر خاموشی کی صورت میں رہتا ہے۔ اگر وہ موجود ہو تو انسان بھیڑ میں بھی پرسکون ہوتا ہے، اور اگر وہ نہ ہو تو سٹیج پر کھڑے ہو کر بھی تنہا رہتا ہے۔

انسان جب سفر شروع کرتا ہے تو اس کا مقصد واضح ہوتا ہے۔ وہ کچھ بننا چاہتا ہے، کچھ حاصل کرنا چاہتا ہے، کچھ ثابت کرنا چاہتا ہے۔ مگر راستے میں ایک موڑ ایسا آتا ہے جہاں مقصد بدل جاتا ہے۔ وہ خود کو ثابت کرنے سے زیادہ

دوسروں کو متاثر کرنے لگتا ہے۔ وہ سچ سے زیادہ تاثر کو اہمیت دینے لگتا ہے۔ یہی وہ لمحہ ہے جہاں شور بڑھنا شروع ہوتا ہے اور اندر خاموشی جنم لیتی ہے۔

میں نے یہ مرحلہ خود محسوس کیا۔ ایک تقریب تھی جہاں مجھے بلایا گیا تھا۔ میں نے تیاری کی، محنت کی، الفاظ ترتیب دیے۔ جب میں نے بات مکمل کی تو تالیاں بجیں۔ لوگ کھڑے ہوئے۔ کسی نے کندھے پر ہاتھ رکھا، کسی نے کہا تم بہت آگے جاؤ گے۔ میں مسکرایا۔ میں نے شکریہ ادا کیا۔ اس لمحے میں کامیاب دکھائی دے رہا تھا۔

مگر جب میں رات کو کمرے میں اکیلا تھا تو عجیب سی خالی پن کی لہر آئی۔ میں نے خود سے پوچھا کہ کیا میں خوش ہوں؟ جواب فوراً نہیں آیا۔ میں نے سوچا شاید تھکن ہے۔ مگر نہیں، یہ تھکن نہیں تھی۔ یہ وہ خلا تھا جو تب پیدا ہوتا ہے جب انسان داد تو لے لے مگر دل کی مکمل بات نہ کہے۔

میں نے اس تقریر میں کچھ باتیں نرم کر دی تھیں۔ کچھ سچ چھپا لیے تھے۔ کچھ جملے بدل دیے تھے تاکہ سب مطمئن

رہیں۔ مجھے داد ملی، مگر مکمل سچ نہیں بولا گیا تھا۔ اور شاید اسی لیے مکمل سکون بھی نہیں ملا۔

تالیوں کا شور وقتی نشہ دیتا ہے۔ وہ تمہیں یہ یقین دلاتا ہے کہ تم اہم ہو۔ مگر اگر تم اس نشے کے عادی ہو جاؤ تو تم ہر کام داد کے لیے کرنے لگتے ہو۔ پھر تم سوال نہیں کرتے کہ یہ درست ہے یا نہیں، تم صرف یہ دیکھتے ہو کہ لوگ کیا پسند کریں گے۔ آہستہ آہستہ تمہارا معیار بدل جاتا ہے۔ تم سچ سے زیادہ مقبولیت کو اہمیت دینے لگتے ہو۔

میں نے محسوس کیا کہ کچھ کام میں صرف اس لیے کر رہا تھا کہ لوگ متاثر ہوں۔ اگر تعریف ملتی تو دن اچھا گزرتا، اگر کوئی خاموش رہتا تو میں بے چین ہو جاتا۔ میری خوشی دوسروں کے ردِعمل پر منحصر ہو گئی تھی۔ یہ احساس بہت دیر سے آیا کہ میں اپنی خوشی کا اختیار دوسروں کو دے چکا ہوں۔

ایک دن میں نے خود سے ایک سخت سوال کیا۔ اگر کل سے کوئی تالیاں نہ بجائے، کوئی نام نہ لے، کوئی تعریف نہ کرے،

تو کیا میں پھر بھی یہی راستہ چنوں گا؟ میں خاموش ہو گیا۔ کچھ چیزوں کا جواب ہاں تھا، مگر کچھ کا نہیں۔ اور یہی فرق اصل تھا۔

اندر کی خاموشی ہمیشہ کمزوری نہیں ہوتی۔ بعض اوقات وہ احتجاج ہوتی ہے۔ وہ ہمیں بتاتی ہے کہ کچھ ہمارے اندر ہمارے خلاف جا رہا ہے۔ کہ ہم وہ نہیں کر رہے جو ہمیں کرنا چاہیے۔ کہ ہم نے اپنی آواز کو پیچھے دھکیل دیا ہے۔ میں نے پہلے اس خاموشی کو نظر انداز کیا۔ میں نے خود کو مصروف رکھا۔ میں نے مزید کام کیے، مزید نمایاں ہونے کی کوشش کی۔ مگر خاموشی شور سے دبتی نہیں، وہ گہری ہوتی جاتی ہے۔

میں نے دیکھا کہ جتنا زیادہ شور بڑھتا ہے، اتنا ہی اندر کا خلا واضح ہوتا جاتا ہے۔ جیسے روشنی جتنی تیز ہو، سایہ اتنا گہرا ہو۔ میں باہر سے مضبوط لگ رہا تھا، مگر اندر سوالوں کی قطار تھی۔ کیا میں وہی ہوں جو میں بننا چاہتا تھا؟ کیا میں اپنی اصل صلاحیت استعمال کر رہا ہوں یا صرف محفوظ راستہ چن رہا ہوں؟ کیا میں سچ بول رہا ہوں یا صرف پسند کیے جانے کی کوشش کر رہا ہوں؟

ایک اور واقعہ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ ایک مقابلے میں مجھے دو راستوں میں سے انتخاب کرنا تھا۔ ایک راستہ مشکل تھا مگر میرے دل کے قریب تھا۔ دوسرا آسان تھا اور جیتنے کے امکانات زیادہ تھے۔ میں نے آسان راستہ چنا۔ میں جیت گیا۔ سب نے سراہا۔ مگر اندر ایک آواز کہہ رہی تھی کہ تم نے آسانی کو سچ پر ترجیح دی ہے۔ وہ جیت مکمل نہیں تھی۔

اسی لمحے میں نے سمجھا کہ کامیابی ہمیشہ اطمینان نہیں دیتی۔ اطمینان تب ملتا ہے جب کامیابی اور ضمیر ایک ہی سمت میں ہوں۔ اگر کامیابی الگ سمت میں ہو اور دل الگ، تو تالیوں کا شور بھی اندر کی خاموشی کو نہیں بھر سکتا۔

ہمیں بچپن سے سکھایا جاتا ہے کہ کامیاب بنو۔ مگر یہ کم سکھایا جاتا ہے کہ کامیابی کی تعریف خود کرو۔ اگر تم اپنی تعریف خود طے نہ کرو تو دنیا تمہارے لیے معیار بنا دے گی۔ اور پھر تم اسی معیار کے پیچھے دوڑتے رہو گے، چاہے وہ تمہارا ہو یا نہ ہو۔

میں نے آہستہ آہستہ یہ سیکھنا شروع کیا کہ داد لینا برا نہیں، مگر اس پر جینا خطرناک ہے۔ میں نے خود سے وعدہ کیا کہ میں وہی کام کروں گا جس پر میں اکیلے میں بھی مطمئن رہ سکوں۔ اگر کسی دن تالیاں نہ بھی بجیں تو مجھے پچھتاوا نہ ہو۔

یہ آسان نہیں تھا۔ کیونکہ انسان کو پسند کیا جانا اچھا لگتا ہے۔ مگر پسند کیے جانے اور خود ہونے میں فرق ہے۔ اگر تم خود ہو کر پسند کیے جاؤ تو وہ اصل کامیابی ہے۔ اگر تم بدل کر پسند کیے جاؤ تو وہ عارضی ہے۔

اب میں جب بھی کسی کامیابی کے بعد اکیلا ہوتا ہوں تو خود سے ایک سوال ضرور کرتا ہوں۔ کیا میں نے سچ کہا؟ کیا میں نے اپنے معیار سے سمجھوتہ کیا؟ اگر جواب صاف ہو تو سکون ملتا ہے۔ اگر نہیں تو میں اگلی بار بہتر کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

کھو جانے کا یہ مرحلہ ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ شور ہمیشہ طاقت کی علامت نہیں ہوتا۔ بعض اوقات وہ کمزوری کو چھپانے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اصل طاقت یہ ہے کہ انسان اپنی خاموشی کو سن سکے۔ اپنی اندر کی آواز کو پہچان سکے۔

آخرکار، زندگی ہمیں سٹیج پر زیادہ دیر نہیں رکھتی۔ تالیاں رک جاتی ہیں۔ لوگ آگے بڑھ جاتے ہیں۔ مگر ہم خود کے ساتھ رہ جاتے ہیں۔ اگر ہم خود سے مطمئن ہوں تو خاموشی خوبصورت لگتی ہے۔ اگر ہم خود سے مطمئن نہ ہوں تو شور بھی بے معنی ہو جاتا ہے۔

شاید "تلاشِ وجود" کا یہ مرحلہ ہمیں یہی سکھاتا ہے کہ کامیابی کا شور سنو، مگر اپنی آواز نہ بھولو۔ کیونکہ اگر اندر کی آواز مضبوط ہو جائے تو باہر کی تالیاں تمہیں بدل نہیں سکتیں۔ اور اگر اندر خاموش ہو جائے تو باہر کا شور تمہیں بچا نہیں سکتا

حصہ اوّل: کھو جانا

باب چہارم: نام کی فکر

جب انسان سچ سے زیادہ اپنی ساکھ کی حفاظت کرنے لگے

نام بچانے میں عمر گزاری تو محفوظ رہا،

سچ نبھایا تو جانا میں آزاد بھی ہو سکتا ہوں۔

میں نے کئی فیصلے صرف اس لیے مؤخر کیے کیونکہ مجھے ڈر تھا کہ اگر میں بدل گیا تو لوگ مجھے بھی بدلتا ہوا کہیں گے۔

نام ایک لفظ نہیں، ایک بوجھ بھی ہے۔ بچپن سے ہمیں بتایا جاتا ہے کہ "اپنا نام بنانا ہے"۔ پھر آہستہ آہستہ یہ جملہ بدل کر ہو جاتا ہے "اپنا نام خراب نہیں کرنا"۔ یوں زندگی کی سمت خاموشی سے تبدیل ہو جاتی ہے۔ ہم تعمیر سے زیادہ حفاظت میں لگ جاتے ہیں۔ ہم بڑھنے سے زیادہ بچنے لگتے ہیں۔ اور اسی بچاؤ میں ہم خود کو محدود کر لیتے ہیں۔

کھو جانے کا یہ مرحلہ سب سے مہذب دکھائی دیتا ہے۔ یہاں کوئی شور نہیں ہوتا، کوئی بغاوت نہیں ہوتی، کوئی واضح

غلطی نہیں ہوتی۔ سب کچھ ترتیب سے ہوتا ہے۔ ہم اچھے بھی رہتے ہیں، مہذب بھی، متوازن بھی۔ مگر اندر کہیں ایک خلا بڑھتا رہتا ہے۔ کیونکہ ہم سچ سے زیادہ اپنی تصویر کی حفاظت کر رہے ہوتے ہیں۔

نام کی فکر ہمیں محتاط بناتی ہے۔ ہم بولنے سے پہلے سوچتے ہیں، قدم رکھنے سے پہلے حساب کرتے ہیں، فیصلے سے پہلے مشورے لیتے ہیں۔ یہ سب بظاہر دانشمندی ہے۔ مگر مسئلہ تب پیدا ہوتا ہے جب احتیاط خوف میں بدل جائے۔ جب ہم اس لیے خاموش رہیں کہ کہیں ہماری ساکھ پر سوال نہ اٹھ جائے۔ جب ہم اس لیے اختلاف نہ کریں کہ کہیں ہمیں ناپسندیدہ نہ سمجھ لیا جائے۔

میں نے اپنی زندگی میں کئی بار خود کو روکا ہے۔ ایک موقع پر میں واقعی کسی معاملے پر کھل کر بات کرنا چاہتا تھا۔ وہ بات شاید کچھ لوگوں کو ناگوار گزرتی، مگر وہ سچ تھی۔ میں نے کئی بار جملہ بنایا، کئی بار ذہن میں دہرایا، مگر ہر بار ایک خیال آ کر رک جاتا تھا: اگر تم نے یہ کہا تو تمہارے بارے میں رائے بدل جائے گی۔ تمہیں سخت سمجھا جائے گا۔ تمہیں مشکل سمجھا جائے گا۔ تمہیں ضدی کہا جائے گا۔ میں نے خاموشی اختیار کی۔ باہر سکون رہا۔ اندر نہیں۔

نام کی فکر کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ انسان آہستہ آہستہ اپنی اصل شکل کھو دیتا ہے۔ وہ اپنے جذبات کو فلٹر کرنے لگتا ہے۔ وہ اپنے سوالوں کو نرم کرنے لگتا ہے۔ وہ اپنی رائے کو قابلِ قبول بنانے کے لیے تراشنے لگتا ہے۔ یوں وہ مکمل سچ نہیں بولتا، بلکہ ایڈجسٹ کیا ہوا سچ بولتا ہے۔ اور ایڈجسٹ کیا ہوا سچ دراصل آدھا سچ ہوتا ہے۔

ایک بار مجھے اپنی ایک غلطی ماننی تھی۔ بات بڑی نہیں تھی، مگر واضح تھی۔ اگر میں معافی مانگ لیتا تو معاملہ وہیں ختم ہو جاتا۔ مگر میں نے سوچا کہ اگر میں نے اعتراف کر لیا تو شاید میری تصویر کمزور ہو جائے۔ شاید لوگ سوچیں کہ میں غیر ذمہ دار ہوں۔ میں نے دفاع کیا، دلیل دی، بات گھمائی۔ وقتی طور پر میں نے خود کو بچا لیا۔ مگر کئی دن تک اندر ایک چبھن رہی۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ میں نے سچائی کو نہیں، اپنی ساکھ کو بچایا ہے۔

یہی وہ لمحے ہوتے ہیں جہاں انسان باہر سے مضبوط اور اندر سے کمزور ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی انا کی حفاظت کرتا ہے مگر اپنے ضمیر کو زخمی کر دیتا ہے۔ نام کی فکر اسے

دوسروں کی نظر میں معتبر رکھتی ہے، مگر اپنی نظر میں ادھورا کر دیتی ہے۔

ہمیں یہ سمجھنا ہوگا کہ نام کا اصل مطلب کیا ہے۔ کیا نام وہ ہے جو لوگ ہمارے بارے میں کہتے ہیں؟ یا نام وہ ہے جو ہم خود کے بارے میں جانتے ہیں؟ اگر لوگ ہمیں عزت دیں مگر ہم خود جانتے ہوں کہ ہم نے کئی مواقع پر سچ سے منہ موڑا ہے، تو کیا وہ عزت مکمل ہے؟

مجھے ایک اور واقعہ یاد ہے۔ میں ایک ایسے راستے پر قدم رکھنا چاہتا تھا جو غیر روایتی تھا۔ وہ محفوظ نہیں تھا، مگر میرا تھا۔ میں نے جب اشارہ دیا تو کچھ لوگوں نے فوراً کہا کہ یہ مناسب نہیں، یہ تمہارے لیے ٹھیک نہیں، اس سے تمہاری تصویر خراب ہو سکتی ہے۔ میں نے کئی راتیں سوچتے گزاریں۔ سوال یہ نہیں تھا کہ راستہ درست ہے یا نہیں۔ سوال یہ تھا کہ اگر میں نے یہ چنا تو لوگ کیا سوچیں گے۔ آخرکار میں نے وہ راستہ نہیں چنا۔ میں نے خود کو سمجھایا کہ میں حقیقت پسند ہوں۔ مگر اندر جانتا تھا کہ میں خوف زدہ ہوں۔

کچھ مہینوں بعد میں نے محسوس کیا کہ میرا پچھتاوا لوگوں کی ناراضی سے بڑا تھا۔ اگر میں وہ راستہ چن لیتا اور ناکام ہو جاتا تو شاید لوگ باتیں کرتے۔ مگر میں خود سے مطمئن ہوتا کہ میں نے کوشش کی۔ اب میں محفوظ تو تھا، مگر مطمئن نہیں۔

نام کی فکر ہمیں رسک لینے سے روکتی ہے۔ ہم غلطی کرنے سے زیادہ بدنام ہونے سے ڈرتے ہیں۔ حالانکہ غلطی سکھاتی ہے، بدنامی صرف وقتی شور ہے۔ آج لوگ بات کرتے ہیں، کل کسی اور موضوع پر چلے جاتے ہیں۔ مگر جو موقع ہم چھوڑ دیتے ہیں، وہ واپس نہیں آتا۔

میں نے آہستہ آہستہ ایک فرق سمجھنا شروع کیا۔ عزت اور خوف میں باریک سا فرق ہے۔ اگر میں غلط کام نہ کروں کیونکہ وہ غلط ہے، تو یہ اصول ہے۔ اگر میں صحیح کام بھی نہ کروں کیونکہ لوگ کچھ کہیں گے، تو یہ خوف ہے۔ اصول انسان کو مضبوط بناتے ہیں، خوف انسان کو محدود۔

کھو جانے کا یہ مرحلہ خاموشی سے ہوتا ہے۔ کوئی اعلان نہیں ہوتا، کوئی ڈرامہ نہیں ہوتا۔ بس انسان آہستہ آہستہ اپنے

دائرے کو چھوٹا کرتا جاتا ہے۔ وہ وہی کرتا ہے جو سب کرتے ہیں۔ وہ وہی کہتا ہے جو سب کہتے ہیں۔ وہ وہی بنتا ہے جو قابلِ قبول ہو۔ یوں وہ محفوظ رہتا ہے، مگر نمایاں نہیں۔

میں نے خود سے ایک سوال پوچھنا شروع کیا: اگر میرا نام نہ ہو، اگر کوئی مجھے نہ جانتا ہو، اگر مجھے کسی تصویر کی حفاظت نہ کرنی ہو، تو میں کیا کروں گا؟ یہ سوال آسان نہیں تھا۔ مگر اس نے مجھے اپنے اندر جھانکنے پر مجبور کیا۔ میں نے دیکھا کہ میرے کئی خواب ایسے تھے جو صرف اس لیے دب گئے کیونکہ میں اپنے نام کو بچانا چاہتا تھا۔

نام اگر سچ کے ساتھ بنے تو طاقت بن جاتا ہے۔ اگر خوف کے ساتھ بنے تو زنجیر بن جاتا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ میں نے اپنی ہی زنجیریں خود بنائی ہیں۔ میں نے لوگوں کی ممکنہ رائے کو اتنی اہمیت دی کہ وہ میرے فیصلوں پر حاوی ہو گئی۔

آہستہ آہستہ میں نے چھوٹے قدم اٹھانے شروع کیے۔ میں نے ایک جگہ اپنی غلطی تسلیم کی۔ مجھے ڈر تھا کہ لوگ کیا

سوچیں گے، مگر نتیجہ توقع سے مختلف تھا۔ لوگوں نے بات سنی، کچھ نے سمجھا، کچھ نے نہیں۔ مگر میں اندر سے ہلکا ہو گیا۔ میں نے پہلی بار محسوس کیا کہ نام کی حفاظت سے زیادہ سچ کی حفاظت سکون دیتی ہے۔

پھر میں نے ایک چھوٹا سا غیر روایتی فیصلہ لیا۔ وہ بڑا نہیں تھا، مگر میرے لیے اہم تھا۔ کچھ لوگوں نے سوال کیے، کچھ نے تنقید کی، مگر دنیا نہیں ٹوٹی۔ میرا نام مٹا نہیں۔ بس چند دن بات ہوئی اور پھر سب معمول پر آ گیا۔ مگر میرے اندر ایک تبدیلی آ گئی۔ مجھے احساس ہوا کہ میں نے سالوں تک ایک مبالغہ آمیز خوف کو حقیقت سمجھ لیا تھا۔

لوگ ہمیشہ کچھ نہ کچھ کہیں گے۔ اگر تم خاموش رہو گے تو بھی کہیں گے۔ اگر تم بولو گے تو بھی کہیں گے۔ اگر تم کامیاب ہو گے تو کہیں گے قسمت تھی۔ اگر ناکام ہو گے تو کہیں گے صلاحیت نہیں تھی۔ اگر تم بدل جاؤ گے تو کہیں گے تم پہلے جیسے نہیں رہے۔ اگر نہ بدلو گے تو کہیں گے تم آگے نہیں بڑھے۔ پھر سوال یہ ہے کہ ہم اپنی زندگی کس کی آواز پر گزاریں؟

میں نے یہ سمجھنا شروع کیا ہے کہ نام کا اصل امتحان تنقید میں ہوتا ہے۔ اگر میں تنقید سن کر بھی سچ پر قائم رہ سکوں تو میرا نام مضبوط ہے۔ اگر میں تعریف سن کر بھی متوازن رہ سکوں تو میرا نام محفوظ ہے۔ مگر اگر میں ہر رائے کے ساتھ بدل جاؤں تو میرا نام صرف ایک عکس ہے، اصل وجود نہیں۔

کھو جانے کے اس مرحلے نے مجھے یہ سکھایا ہے کہ انسان کو ایک دن فیصلہ کرنا پڑتا ہے۔ وہ یا تو اپنی ساکھ کا محافظ بن کر جئے گا، یا اپنے سچ کا امین بن کر۔ دونوں ایک ساتھ ہمیشہ ممکن نہیں ہوتے۔ کبھی کبھی سچ بولنے کے لیے تصویر داؤ پر لگانی پڑتی ہے۔

میں مکمل آزاد نہیں ہوا ہوں۔ آج بھی کبھی کبھی دل میں خیال آتا ہے کہ یہ فیصلہ لوگوں کو کیسا لگے گا۔ مگر اب میں اس خیال کو حتمی حکم نہیں مانتا۔ میں اس کے ساتھ ایک اور سوال رکھتا ہوں: اگر میں نے یہ نہ کیا تو میں خود کو کیسا لگوں گا؟ یہی دوسرا سوال میری سمت طے کرتا ہے۔

آخرکار، نام مٹی میں لکھا ہوا لفظ ہے، وقت کی ہوا اسے بدل سکتی ہے۔ مگر ضمیر پتھر پر لکھی تحریر ہے، وہ دیر تک قائم رہتی ہے۔ میں نے دیر سے سہی، مگر یہ سمجھ لیا ہے کہ اگر مجھے کچھ بچانا ہے تو وہ میرا سچ ہے، نہ کہ میری تصویر۔ کیونکہ جب تصویر ٹوٹتی ہے تو شور ہوتا ہے، مگر جب سچ ٹوٹتا ہے تو انسان اندر سے خالی ہو جاتا ہے۔

حصہ دوم: ٹوٹ جانا

حصہ دوم: ٹوٹ جانا

باب پنجم: دل کا انہدام

جہاں دل گرتا ہے، وہیں انا دفن ہوتی ہے۔

میں دیوارِ انا تھا،
زمانہ مجھے مضبوط سمجھتا رہا،
دل گرا تو معلوم ہوا میں اندر سے خالی تھا۔

دل کے گرنے کی آواز کسی اور کو سنائی نہیں دیتی، مگر جس کے اندر گرتا ہے وہ عمر بھر اس کی گونج سنتا رہتا ہے۔ میں نے بھی وہ گونج سنی تھی۔ وہ کسی حادثے کی طرح اچانک نہیں آئی، وہ آہستہ آہستہ میرے اندر جگہ بناتی رہی یہاں تک کہ ایک دن میں نے محسوس کیا کہ میں اپنے ہی وجود کے ملبے پر کھڑا ہوں۔ باہر سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا پہلے تھا، مگر اندر ایک پوری عمارت بیٹھ چکی تھی۔ میں سمجھتا رہا کہ میں سنبھلا ہوا ہوں، مگر حقیقت یہ تھی کہ میں صرف کھڑا تھا، مضبوط نہیں تھا۔

میں نے زندگی کے پہلے حصے میں خود کو بچانے کی بہت کوشش کی۔ میں نے خاموشی اوڑھی، میں نے برداشت کو

بہادری سمجھا، میں نے مسکراہٹ کو ڈھال بنایا۔ مجھے لگتا تھا جو شخص نہیں ٹوٹتا وہی کامیاب ہے۔ مگر میں یہ نہیں جانتا تھا کہ نہ ٹوٹنے کی ضد انسان کو اندر سے کھوکھلا کر دیتی ہے۔ دل کا انہدام کسی ایک دھچکے سے نہیں ہوتا، یہ مسلسل نظرانداز کیے گئے درد کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ہر وہ لمحہ جب میں نے کہا "میں ٹھیک ہوں" حالانکہ میں ٹھیک نہیں تھا، میری بنیاد کمزور ہوتی گئی۔

وہ رات آج بھی مجھے یاد ہے جب میں پہلی بار خود سے ہارا تھا۔ باہر خاموشی تھی مگر میرے اندر شور تھا۔ میں نے خود سے سوال کیا کہ آخر میں کس کے لیے مضبوط بنا ہوا ہوں؟ کون دیکھ رہا ہے؟ کون گن رہا ہے میری برداشت؟ اس سوال نے مجھے توڑ دیا۔ کیونکہ میں نے ساری زندگی دوسروں کی نظر میں قائم رہنے کی کوشش کی تھی، اپنی نظر میں نہیں۔ میں نے اپنی کمزوری کو دشمن سمجھا، حالانکہ وہی میری سب سے سچی پہچان تھی۔

دل کا انہدام دراصل تصویر کے ٹوٹنے کا نام ہے۔ وہ تصویر جو ہم نے اپنے بارے میں بنا رکھی ہوتی ہے۔ میں نے بھی اپنے لیے ایک کردار بنا لیا تھا — سمجھدار، سنجیدہ، مضبوط۔ مگر میں یہ بھول گیا تھا کہ کردار نبھانے والا انسان

بھی سانس لیتا ہے، وہ بھی تھکتا ہے۔ جب اس کردار کی دیواریں گریں تو میں پہلی بار اپنے سامنے بے نقاب کھڑا تھا۔ نہ کوئی بہانہ تھا، نہ کوئی دفاع۔ صرف میں تھا اور میرا سچ۔

ٹوٹنے کا سب سے کٹھن پہلو یہ ہے کہ آپ کو اپنی کمزوری تسلیم کرنی پڑتی ہے۔ میں نے ہمیشہ یہ سوچا تھا کہ آنسو کمزوری ہیں، مگر اس رات جب آنسو بہے تو مجھے لگا جیسے برسوں کا بوجھ ہلکا ہو گیا ہو۔ وہ شکست کے آنسو نہیں تھے، وہ اعتراف کے آنسو تھے۔ میں نے پہلی بار خود سے کہا کہ میں کامل نہیں ہوں، اور شاید مجھے کامل ہونے کی ضرورت بھی نہیں۔ یہ جملہ چھوٹا تھا مگر اس نے میرے اندر ایک نئی جگہ بنا دی۔

دل کا انہدام صرف کسی شخص کے جانے سے نہیں ہوتا، کبھی یہ اپنے خواب کے ٹوٹنے سے ہوتا ہے، کبھی اپنی امید کے مرنے سے، کبھی اس یقین کے بکھرنے سے کہ “میں سب سنبھال لوں گا”۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ میں نے خود کو اتنا مضبوط مان لیا تھا کہ جب حقیقت نے مجھے آئینہ دکھایا تو میں برداشت نہ کر سکا۔ میں نے سوچا تھا میں گر نہیں سکتا، مگر میں گر گیا۔ اور جب میں گرا تو مجھے

اندازہ ہوا کہ زمین اتنی سخت نہیں جتنی میں سمجھتا تھا، اصل سختی تو میرے اندر تھی۔

میں نے ٹوٹنے کے بعد ایک عجیب خالی پن محسوس کیا۔ جیسے میرے اندر کا شور ختم ہو گیا ہو، مگر سکون ابھی آیا نہ ہو۔ یہ درمیانی کیفیت سب سے زیادہ اذیت دیتی ہے۔ نہ آپ پہلے جیسے رہتے ہیں، نہ مکمل نئے بنتے ہیں۔ آپ بس کھڑے رہتے ہیں، سوچتے رہتے ہیں، خود کو دیکھتے رہتے ہیں۔ میں بھی اسی مرحلے سے گزرا۔ میں نے خود سے وہ سوال کیے جن سے میں برسوں بھاگتا رہا تھا۔ میں نے پوچھا کیا میں واقعی وہی ہوں جو لوگوں کو نظر آتا ہے؟ یا میں صرف ان کی توقعات کا عکس ہوں؟

دل کا انہدام دراصل انا کی موت ہے۔ جب تک انا زندہ رہتی ہے، انسان خود کو درست مانتا رہتا ہے۔ مگر جیسے ہی انا میں دراڑ پڑتی ہے، انسان کو اپنی اصل شکل دکھائی دیتی ہے۔ مجھے بھی وہی شکل نظر آئی — نہ بہت مضبوط، نہ بہت کمزور، بس ایک عام سا انسان جو محبت چاہتا ہے، قبولیت چاہتا ہے، اور کبھی کبھی سہارے کی ضرورت بھی محسوس کرتا ہے۔ میں نے خود کو اس نظر سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

اگر یہ میرا اپنا اعتراف ہے تو میں یہ کہوں گا کہ میں ٹوٹ کر بہتر ہوا ہوں۔ میں نے سیکھا کہ جو دل کبھی نہیں ٹوٹتا وہ کبھی نرم بھی نہیں ہوتا۔ جو انسان کبھی نہیں گرتا وہ کبھی عاجزی نہیں سیکھتا۔ میرے دل کا انہدام میرے لیے سزا نہیں تھا، وہ ایک سبق تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ مضبوطی دکھانے میں نہیں، سچ مان لینے میں ہے۔

آج میں جب اس مرحلے کو یاد کرتا ہوں تو مجھے خوف نہیں آتا، بلکہ شکر آتا ہے۔ اگر وہ عمارت نہ گرتی تو میں آج بھی اس کے سائے میں خود کو ڈھونڈ رہا ہوتا۔ ٹوٹنے نے مجھے روکا، مجھے آئینہ دکھایا، اور مجھے مجبور کیا کہ میں نئی بنیاد رکھوں۔ اس بار بنیاد دوسروں کی رائے پر نہیں، اپنے سچ پر ہے۔

دل کا انہدام انجام نہیں، آغاز ہے۔ یہ وہ دروازہ ہے جہاں سے انسان اپنی اصل طرف لوٹنا شروع کرتا ہے۔ اور شاید زندگی کا سب سے بڑا تحفہ یہی ہے کہ وہ ہمیں کبھی کبھی توڑ دیتی ہے تاکہ ہم پہلی بار سچ میں بن سکیں۔

حصہ دوم: ٹوٹ جانا

باب ششم: سوالوں کا بوجھ

کچھ سوال جواب نہیں مانگتے، وہ انسان کے اندر چھپے جھوٹ کو بے نقاب کرنے آتے ہیں۔

میں عمر بھر جوابوں کے پیچھے چھپتا رہا،

سوال آئے تو میرا اصل چہرہ سامنے آ گیا۔

دل کے انہدام کے بعد جو چیز سب سے پہلے جنم لیتی ہے وہ سکون نہیں بلکہ اضطراب ہوتا ہے، اور اس اضطراب کی شکل سوال ہوتے ہیں۔ جب عمارت گرتی ہے تو ملبہ زمین پر بکھر جاتا ہے، مگر جب یقین گرتا ہے تو اس کے ٹکڑے ذہن میں چبھنے لگتے ہیں۔ میں نے بھی یہی محسوس کیا۔ جب میری انا کی دیواریں گریں تو میں خالی نہیں ہوا، میں بھاری ہو گیا۔ جیسے کسی نے میرے کندھوں پر وہ تمام سوال رکھ دیے ہوں جنہیں میں برسوں سے ٹالتا آیا تھا۔

میں نے ہمیشہ سوال کو کمزوری سمجھا تھا۔ مجھے لگتا تھا مضبوط لوگ زیادہ نہیں سوچتے، وہ یقین کے ساتھ چلتے ہیں۔ مگر میں نے دیکھا کہ میرا یقین ہی میرا سب سے بڑا

فریب تھا۔ میں خود کو جانتا تھا، ایسا میں سمجھتا تھا۔ مگر جب دل ٹوٹا تو پہلی بار میں نے خود سے پوچھا: اگر میں وہ نہیں ہوں جو میں نے خود کو بتایا تھا، تو پھر میں کون ہوں؟ یہ سوال بظاہر سادہ تھا، مگر اس نے میری بنیاد ہلا دی۔

سوالوں کا بوجھ جسم پر نہیں، روح پر پڑتا ہے۔ میں دن بھر معمول کے مطابق رہتا، لوگوں سے ملتا، ہنستا بھی، مگر اندر ایک عدالت سی لگی رہتی۔ ہر لمحہ ایک نیا سوال اٹھتا۔ میں دوسروں کو خوش کرنے میں کیوں لگا رہا؟ میں نے کب اپنی آواز کو دبایا؟ میں نے کب اپنی سچائی سے سمجھوتہ کیا؟ یہ سوال میرے اندر گونجتے اور ہر گونج کے ساتھ میں خود سے تھوڑا سا مزید بے نقاب ہوتا جاتا۔

ایک شام میں اکیلا بیٹھا تھا۔ بارش ہو رہی تھی اور کمرے میں ہلکی سی نمی تھی۔ میں نے خود سے پوچھا: کیا میں اپنی زندگی جی رہا ہوں یا کسی اور کی توقعات؟ یہ سوال میرے لیے سب سے بھاری تھا۔ کیونکہ اگر جواب یہ ہوتا کہ میں دوسروں کے نقش قدم پر چل رہا ہوں تو اس کا مطلب یہ تھا کہ میں نے ابھی تک اپنا راستہ بنایا ہی نہیں۔ اس لمحے مجھے پہلی بار اپنے وجود پر شک ہوا۔

سوال انسان کو دو حصوں میں بانٹ دیتے ہیں۔ ایک وہ جو سچ سننا چاہتا ہے، اور دوسرا وہ جو سچ سے ڈرتا ہے۔ میں بھی اسی کشمکش میں تھا۔ میں جاننا چاہتا تھا، مگر مجھے خوف تھا کہ اگر سچ میری مرضی کے خلاف نکلا تو؟ اگر میں واقعی اتنا مضبوط نہ ہوا جتنا میں سمجھتا تھا؟ اگر میری کئی کامیابیاں دراصل سمجھوتے تھیں؟ یہ خیالات آندھی کی طرح نہیں آتے، وہ دھند کی طرح چھا جاتے ہیں اور آہستہ آہستہ سب کچھ دھندلا دیتے ہیں۔

دنیا ہمیں فوری جواب چاہنے کی عادت ڈال دیتی ہے۔ ہمیں سکھایا جاتا ہے کہ ہر مسئلے کا حل ہونا چاہیے۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ کچھ سوال حل کے لیے نہیں ہوتے، وہ بیداری کے لیے ہوتے ہیں۔ وہ ہمیں مجبور کرتے ہیں کہ ہم رکیں اور اپنی بنیاد کو دوبارہ دیکھیں۔ میں نے پہلی بار اپنے یقینوں کو پرکھا۔ کون سا یقین میرا تھا اور کون سا مجھے سکھایا گیا تھا؟ کون سی خواہش میری تھی اور کون سی دوسروں کی پسند؟

مجھے اپنا بچپن یاد آیا، جب میں ہر بات پر سوال کرتا تھا۔ لوگ مسکرا کر کہتے تھے، تم بہت سوچتے ہو۔ آہستہ آہستہ میں نے سوال کرنا کم کر دیا، کیونکہ زیادہ سوچنے والے

لوگوں کو پیچیدہ سمجھا جاتا ہے۔ مگر اب جب دل ٹوٹ چکا تھا، سوالوں نے دوبارہ دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس بار میں نے دروازہ بند نہیں کیا۔ میں جان چکا تھا کہ اگر میں نے اب بھی سوالوں سے بھاگنے کی کوشش کی تو میں پھر وہی پرانا انسان بن جاؤں گا۔

سوالوں کا بوجھ دراصل ذمہ داری کا بوجھ ہے۔ جب آپ سوال کرتے ہیں تو آپ کو جواب خود تلاش کرنا پڑتا ہے۔ میں نے اپنی ناکامیوں کا الزام حالات پر ڈالا تھا، لوگوں پر ڈالا تھا، مگر سوالوں نے مجھے آئینہ دکھایا۔ انہوں نے پوچھا: تم نے کیا کیا؟ تم نے کب اپنے لیے کھڑے ہونے کی کوشش کی؟ تم نے کب سچ بولنے کا خطرہ مول لیا؟ یہ سوال تکلیف دہ تھے، مگر ان میں ہی میری نجات چھپی تھی۔

ایک رات میں نے اپنی ڈائری نکالی اور سارے سوال لکھ ڈالے۔ میں کس چیز سے ڈرتا ہوں؟ مجھے سب سے زیادہ کس بات کا افسوس ہے؟ اگر مجھے دوبارہ موقع ملے تو میں کیا بدلوں گا؟ جب یہ سوال کاغذ پر آئے تو وہ دشمن نہیں لگے۔ وہ رہنما لگے۔ میں نے محسوس کیا کہ سوال اندھیرے میں جلنے والی شمع ہیں۔ وہ پورا راستہ روشن نہیں کرتے، مگر اگلا قدم ضرور دکھا دیتے ہیں۔

کبھی کبھی سوال اتنے بڑھ جاتے کہ میں تھک جاتا۔ میں نے سوچنا چھوڑنے کی کوشش کی، مگر سوال خاموشی میں اور بلند ہو جاتے۔ تب میں نے سمجھا کہ مقصد ہر سوال کا جواب ڈھونڈنا نہیں، بلکہ اس کے ساتھ جینا سیکھنا ہے۔ کچھ سوال وقت کے ساتھ کھلتے ہیں، کچھ تجربے کے ساتھ، اور کچھ صرف قبولیت کے ساتھ۔

میں نے خود سے پوچھا کہ میں دوسروں کی رائے سے اتنا متاثر کیوں ہوتا ہوں؟ جواب فوراً نہیں ملا، مگر آہستہ آہستہ میں نے دیکھا کہ میں نے اپنی قدر کو دوسروں کی تعریف سے جوڑ رکھا تھا۔ جب تعریف کم ہوئی تو میرا اعتماد بھی کم ہو گیا۔ یہ سچ کڑوا تھا، مگر اسی کڑواہٹ میں شفا تھی۔

سوالوں نے مجھے عاجزی سکھائی۔ میں نے پہلی بار مانا کہ میں سب نہیں جانتا۔ میں غلط ہو سکتا ہوں۔ یہ اعتراف آسان نہیں تھا، مگر اسی نے مجھے نرم کیا۔ پہلے میں ہر بحث میں جیتنا چاہتا تھا، اب میں سمجھنا چاہتا تھا۔ پہلے میں ہر فیصلہ ثابت کرنا چاہتا تھا، اب میں ہر فیصلہ پرکھنا چاہتا تھا۔

ایک سوال بار بار لوٹ کر آتا تھا: کیا میں خود کو معاف کر سکتا ہوں؟ میں اپنی غلطیوں کو دل میں قید کیے بیٹھا تھا۔ میں خود کو سزا دیتا رہا، حالانکہ دنیا مجھے بھول چکی تھی۔ سوالوں نے مجھے دکھایا کہ میں خود ہی اپنا جج بنا ہوا ہوں۔ جب میں نے خود کو معاف کرنا شروع کیا تو سوالوں کا وزن کم ہونے لگا۔

آج بھی میرے پاس ہر سوال کا جواب نہیں۔ مگر فرق یہ ہے کہ میں اب سوالوں سے ڈرتا نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ وہ مجھے گرانے نہیں، جگانے آتے ہیں۔ وہ مجھے یاد دلاتے ہیں کہ میں ابھی مکمل نہیں ہوا۔ اگر میرے پاس ہر جواب ہوتا تو شاید میں رک جاتا۔ مگر سوال مجھے حرکت میں رکھتے ہیں۔

باب ششم میرے لیے درد کا نہیں، بیداری کا باب ہے۔ یہاں آنسو کم ہیں، سوچ زیادہ ہے۔ یہاں شور کم ہے، گہرائی زیادہ ہے۔ سوالوں کا بوجھ مجھے جھکاتا ضرور ہے، مگر اسی جھکاؤ میں میری اصلاح ہے۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں سوالوں سے نہیں بھاگوں گا۔

اگر دل کا انہدام مجھے زمین پر لے آیا تھا تو سوالوں کا بوجھ مجھے سیدھا کھڑا کرنا سکھا رہا ہے۔ کیونکہ جو انسان اپنے سوالوں کا سامنا کر لیتا ہے، وہ اپنے مستقبل سے نہیں ڈرتا۔ اور میں اب ڈر کر نہیں جینا چاہتا۔ میں جاننا چاہتا ہوں، چاہے جاننے کی قیمت بے چینی ہی کیوں نہ ہو۔ یہی بے چینی میری حرکت ہے۔ یہی سوال میرے سفر کا ایندھن ہیں۔

حصہ دوم: ٹوٹ جانا

باب ہشتم: نفس کی عدالت

اصل احتساب وہ ہے جہاں انسان بہانے دفن کر کے سچ کو زندہ کر دے۔

کٹہرے میں کھڑا تھا میں، نظر جھکی ہوئی مگر صاف،

جو جرم مان لیا خود سے، وہی میری نجات بنا۔

دل کے انہدام اور سوالوں کے بوجھ کے بعد ایک مرحلہ ایسا آتا ہے جہاں بھاگنے کی گنجائش ختم ہو جاتی ہے۔ میں آئینے کے سامنے کھڑا تو ہو گیا تھا، مگر آئینہ صرف چہرہ دکھاتا ہے، کردار نہیں۔ کردار دیکھنے کے لیے عدالت لگانی پڑتی ہے۔ اور یہ عدالت باہر نہیں، اندر لگتی ہے۔ نفس کی عدالت۔ وہ مقام جہاں کوئی وکیل نہیں ہوتا، کوئی گواہ جھوٹ نہیں بول سکتا، اور کوئی تالی نہیں بجتی۔ صرف سچ ہوتا ہے، ننگا اور بے رحم۔

میں نے ساری زندگی اپنے حق میں دلائل جمع کیے تھے۔ میں نے ہر غلطی کا جواز بنایا، ہر کمزوری کو حالات کا نام

دیا، ہر کوتاہی کو مجبوری کہہ کر ٹال دیا۔ مگر جب میں اپنی ہی عدالت میں کھڑا ہوا تو مجھے اندازہ ہوا کہ میں کتنا ماہر وکیل تھا، مگر کتنا کمزور انسان۔ میں نے اپنے خلاف کبھی مقدمہ چلنے ہی نہیں دیا تھا۔ اس دن پہلی بار میں نے خود کو کٹہرے میں کھڑا کیا۔

یہ آسان نہیں تھا۔ انسان اپنے بارے میں نرم ہوتا ہے۔ ہم دوسروں کی غلطی فوراً دیکھ لیتے ہیں، مگر اپنی خطا کو دلیلوں میں لپیٹ دیتے ہیں۔ نفس کی عدالت میں سب سے پہلے یہی لپیٹے ہوئے جواز کھلتے ہیں۔ میں نے خود سے پوچھا: کیا واقعی تم مجبور تھے؟ کیا واقعی تمہارے پاس کوئی اور راستہ نہیں تھا؟ یا تم نے آسان راستہ چنا؟ یہ سوال تیر کی طرح لگے، کیونکہ میں جانتا تھا کہ ان کے جواب میرے پاس ہیں، مگر میں نے انہیں کبھی سنجیدگی سے سنا نہیں تھا۔

میں نے اپنی خاموشیوں کا حساب لیا۔ وہ مواقع یاد کیے جب مجھے بولنا چاہیے تھا مگر میں چپ رہا۔ میں نے اپنی خود غرضیوں کو دیکھا، وہ لمحے جب میں نے صرف اپنی سہولت کو ترجیح دی۔ میں نے اپنی کمزوریوں کو نام دیا۔ پہلے میں انہیں حالات کہتا تھا، اب میں انہیں اپنی کمزوری

کہنے لگا۔ یہ تبدیلی چھوٹی نہیں تھی۔ یہ وہ لمحہ تھا جب میں نے الزام دینا چھوڑا اور ذمہ داری اٹھانا شروع کی۔

نفس کی عدالت میں سب سے مشکل مرحلہ اعتراف ہوتا ہے۔ جب آپ خود مان لیتے ہیں کہ ہاں، غلطی میری تھی۔ میں نے بھی یہ جملہ ادا کیا۔ آہستہ، ٹوٹتے ہوئے، مگر سچ کے ساتھ مجھے لگا جیسے میرے اندر کوئی دیوار گر رہی ہو۔ مگر اس بار یہ دیوار انا کی تھی۔ اعتراف نے مجھے کمزور نہیں کیا، اس نے مجھے ہلکا کیا۔ کیونکہ جب تک انسان اپنی خطا کو مانتا نہیں، وہ اس کا بوجھ اٹھاتا رہتا ہے۔

میں نے اپنے خوفوں کو بھی گواہ بنایا۔ میں نے دیکھا کہ میں کتنی بار ڈر کی وجہ سے پیچھے ہٹا۔ کتنی بار میں نے اپنی عزت بچانے کے لیے سچ چھپایا۔ میں نے خود سے پوچھا کہ کیا تم واقعی ایماندار تھے؟ یا تم صرف اچھا دکھائی دینا چاہتے تھے؟ یہ سوال مجھے اندر تک چیر گیا۔ میں نے سمجھا کہ میں اچھا بننے کی کوشش میں سچا ہونا بھول گیا تھا۔

نفس کی عدالت میں کوئی تماشائی نہیں ہوتا، مگر اس کی گونج دور تک جاتی ہے۔ اس دن میں نے محسوس کیا کہ میں خود کو برسوں سے دھوکہ دے رہا تھا۔ میں اپنی کہانی کا ہیرو بنا ہوا تھا، مگر میں نے اپنے کردار کی کمزوریوں کو کبھی قبول نہیں کیا۔ جب میں نے خود کو مجرم مانا تو عجیب سکون آیا۔ کیونکہ مجرم مان لینے کے بعد ہی سزا قبول کی جا سکتی ہے، اور سزا قبول کیے بغیر اصلاح ممکن نہیں۔

میں نے اپنی نیتوں کا جائزہ لیا۔ نیت وہ جگہ ہے جہاں انسان خود سے بھی جھوٹ بول لیتا ہے۔ میں نے دیکھا کہ کئی بار میری نیکی کے پیچھے تعریف کی خواہش تھی۔ کئی بار میری خاموشی کے پیچھے بزدلی تھی۔ کئی بار میری سختی کے پیچھے انا تھی۔ یہ سچ آسان نہیں تھے، مگر یہی سچ میری اصلاح کا دروازہ تھے۔

ایک لمحہ ایسا بھی آیا جب میں نے خود کو معاف کرنے کا سوال اٹھایا۔ اگر میں مجرم ہوں تو کیا میں خود کو سزا دوں؟ یا اصلاح کا موقع؟ نفس کی عدالت صرف سزا دینے کے لیے نہیں ہوتی، وہ توازن سکھانے کے لیے بھی ہوتی ہے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میں خود کو معاف کروں گا، مگر شرط

کے ساتھ شرط یہ کہ میں وہی غلطی دوبارہ نہیں دہراوں گا۔ معافی بغیر تبدیلی کے صرف ایک بہانہ ہوتی ہے۔

میں نے محسوس کیا کہ احتساب انسان کو توڑتا نہیں، سیدھا کرتا ہے۔ جیسے ٹیڑھی لکڑی کو سیدھا کرنے کے لیے دباؤ ڈالا جاتا ہے، ویسے ہی نفس کی عدالت انسان کو اپنی اصل شکل میں لاتی ہے۔ میں پہلے خود کو معصوم سمجھتا تھا، اب میں خود کو ذمہ دار سمجھنے لگا تھا۔ یہ فرق بہت بڑا تھا۔ معصومیت انسان کو بچاتی ہے، مگر ذمہ داری اسے بناتی ہے۔

اس عدالت میں میں نے اپنی ترجیحات بھی دیکھی۔ میں نے جانچا کہ میں کس چیز کو سب سے زیادہ اہم سمجھتا ہوں۔ کیا میں سچ کو ترجیح دیتا ہوں یا سہولت کو؟ کیا میں عزت کو اہم سمجھتا ہوں یا دکھاوے کو؟ ان سوالوں نے میرے اندر ایک نیا معیار پیدا کیا۔ اب میں فیصلے کرتے وقت صرف یہ نہیں سوچتا تھا کہ لوگ کیا کہیں گے، بلکہ یہ بھی سوچتا تھا کہ میں خود کو کیا جواب دوں گا۔

نفس کی عدالت کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ وہ انسان کو آزاد کرتی ہے۔ جب آپ خود کو سچ بتا دیتے ہیں تو کوئی اور آپ کو بلیک میل نہیں کر سکتا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں پہلے لوگوں کے فیصلوں سے ڈرتا تھا، مگر اب میں اپنے فیصلے سے ڈرنے لگا تھا۔ اور یہی ڈر مجھے سیدھا رکھتا تھا۔

یہ مرحلہ دردناک تھا، مگر ضروری تھا۔ اگر میں سوالوں کے بعد بھی احتساب نہ کرتا تو شاید میں صرف سوچنے والا انسان بن کر رہ جاتا۔ احتساب نے مجھے عمل کی طرف دھکیلا۔ میں نے اپنی کچھ عادتیں بدلی، کچھ تعلقات کا جائزہ لیا، کچھ حدود طے کیں۔ یہ سب آسان نہیں تھا، مگر نفس کی عدالت کے بعد میں جان چکا تھا کہ میں اپنے فیصلوں کا ذمہ دار ہوں۔

آج جب میں پیچھے دیکھتا ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ یہ باب میرے سفر کا سب سے اہم موڑ تھا۔ یہاں میں نے خود کو کھویا نہیں، بلکہ پایا۔ کیونکہ جو انسان خود کو کٹہرے میں کھڑا کر لیتا ہے، وہ دنیا کے کسی بھی کٹہرے سے نہیں ڈرتا۔ نفس کی عدالت نے مجھے سکھایا کہ انصاف صرف

مانگنے کی چیز نہیں، دینے کی بھی چیز ہے اور سب سے پہلے یہ انصاف خود کے ساتھ کرنا ہوتا ہے۔

حصہ دوم یہاں اپنی انتہا کی طرف بڑھ رہا ہے۔ دل ٹوٹ چکا، سوال اٹھ چکے، آئینہ دکھا چکا، اور اب فیصلہ سنایا جا چکا۔ اگلا مرحلہ سزا نہیں، سکون ہے۔ کیونکہ جب انسان خود کو سچ سنا دیتا ہے تو اس کے اندر ایک نئی خاموشی جنم لیتی ہے۔ وہ خاموشی جو ہار کی نہیں، قبولیت کی ہوتی ہے۔

نفس کی عدالت نے مجھے جھکایا، مگر اسی جھکاؤ میں میری قامت سیدھی ہوئی۔ میں نے جان لیا کہ اصل بہادری دوسروں کو غلط ثابت کرنا نہیں، خود کو درست کرنا ہے۔ اور شاید یہی وہ مقام ہے جہاں سے "ٹوٹ جانا" ختم ہوتا ہے اور "پا لینا" شروع ہونے کی تیاری کرتا ہے۔

حصہ دوم: ٹوٹ جانا

باب نہم: خاموشی کا جنم

جب اندر کا شور مر جاتا ہے تو اصل آواز سنائی دیتی ہے۔

میں چیختا رہا برسوں اپنی صفائی میں،

خاموش ہوا تو سچ خود بولنے لگا۔

نفس کی عدالت کے بعد میں تھک گیا تھا۔ یہ وہ تھکن نہیں تھی جو جسم کو آتی ہے، یہ وہ تھکن تھی جو انسان کے غرور کو آتی ہے۔ میں نے خود کو کٹہرے میں کھڑا کیا، اپنے خلاف گواہی سنی، فیصلہ قبول کیا۔ اور پھر ایک عجیب سا سکوت میرے اندر اترنے لگا۔ پہلے میں سمجھا شاید یہ ہار ہے، شاید میں ٹوٹ کر بے حس ہو گیا ہوں۔ مگر آہستہ آہستہ مجھے احساس ہوا کہ یہ بے حسی نہیں، یہ ایک نئی کیفیت ہے۔ یہ خاموشی کا جنم تھا۔

پہلے میرے اندر مسلسل شور رہتا تھا۔ کبھی اپنی صفائی کا، کبھی اپنی برتری کا، کبھی اپنی بے گناہی کا۔ میں ہر وقت اپنے آپ کو ثابت کرنے میں لگا رہتا تھا۔ لوگوں کے سامنے بھی، اور اپنے سامنے بھی۔ مگر احتساب کے بعد جب میں

نے خود کو مجرم مان لیا تو صفائی دینے کی ضرورت ختم ہو گئی۔ اور جب صفائی کی ضرورت ختم ہو جائے تو شور بھی مر جاتا ہے۔

خاموشی اچانک نہیں آتی۔ وہ آہستہ آہستہ دل میں جگہ بناتی ہے۔ جیسے بارش کے بعد زمین ٹھنڈی ہو جاتی ہے، ویسے ہی نفس کی عدالت کے بعد میرا اندر ٹھنڈا ہونے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں اب ہر بات پر ردِعمل نہیں دیتا۔ پہلے ایک لفظ مجھے دن بھر بے چین رکھتا تھا، اب وہی لفظ آتا اور گزر جاتا۔ پہلے میں ہر بحث جیتنا چاہتا تھا، اب میں ہر بحث میں بولنا بھی ضروری نہیں سمجھتا تھا۔

یہ خاموشی کمزوری نہیں تھی۔ یہ ہار مان لینے والی چپ نہیں تھی۔ یہ سمجھ کی خاموشی تھی۔ میں نے جان لیا تھا کہ ہر آواز کا جواب دینا ضروری نہیں ہوتا۔ کچھ آوازیں خود ہی مر جاتی ہیں اگر آپ انہیں خوراک نہ دیں۔ پہلے میں ہر تنقید کو حملہ سمجھتا تھا، اب میں ہر تنقید کو آئینہ سمجھنے لگا تھا۔ اور اگر آئینہ سچ نہ بھی دکھائے تو بھی اسے توڑنے سے چہرہ نہیں بدلتا۔

مجھے یاد ہے ایک موقع جب کسی نے میرے بارے میں غلط بات کہی۔ پہلے والا میں ہوتا تو فوراً صفائی دیتا، دلیلیں دیتا، شاید غصہ بھی کرتا۔ مگر اس بار میں خاموش رہا۔ نہ اس لیے کہ میں ڈر گیا تھا، بلکہ اس لیے کہ میں جانتا تھا میرا سچ میرے اندر محفوظ ہے۔ اس لمحے مجھے اپنی خاموشی پر فخر ہوا۔ یہ وہ خاموشی تھی جو خود اعتمادی سے پیدا ہوئی تھی، خوف سے نہیں۔

خاموشی کا جنم دراصل انا کی موت کے بعد ہوتا ہے۔ جب تک انا زندہ رہتی ہے، انسان کو ہر وقت اپنی اہمیت ثابت کرنی پڑتی ہے۔ مگر جب انا دفن ہو جائے تو انسان کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کی قدر شور سے نہیں بڑھتی۔ میں نے پہلے عزت مانگی تھی، اب میں نے کردار بنانا شروع کیا۔ میں نے پہلے تعریف ڈھونڈی تھی، اب میں نے سچ ڈھونڈنا شروع کیا۔

اس خاموشی میں ایک عجیب سی روشنی تھی۔ میں پہلے سمجھتا تھا روشنی کا مطلب خوشی ہے، قہقہے ہیں، کامیابی ہے۔ مگر اب میں نے دیکھا کہ روشنی کبھی کبھی سکوت کی صورت میں آتی ہے۔ میں اکیلا بیٹھتا اور مجھے گھبراہٹ نہیں ہوتی تھی۔ پہلے تنہائی مجھے ڈراتی تھی، کیونکہ تنہائی

میں میرا شور میرا پیچھا کرتا تھا۔ اب تنہائی میں سکون تھا۔ جیسے میرے اندر کوئی لڑائی ختم ہو گئی ہو۔

میں نے محسوس کیا کہ میں کم بولنے لگا ہوں، مگر جب بولتا ہوں تو زیادہ سچ بولتا ہوں۔ میں کم وعدے کرتا ہوں، مگر جو کرتا ہوں وہ نبھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ خاموشی نے مجھے محتاط نہیں بنایا، اس نے مجھے واضح بنایا ہے۔ پہلے میں ہر سمت بھاگتا تھا، اب میں قدم سوچ کر اٹھاتا ہوں۔

حصہ دوم کا یہ آخری باب میرے لیے شکست کا اختتام نہیں، شور کا اختتام ہے۔ میں ٹوٹا، میں نے سوال کیے، میں نے خود کو کٹہرے میں کھڑا کیا، اور اب میں خاموش ہوں۔ مگر یہ خاموشی قبر کی نہیں، پیدائش کی ہے۔ جیسے بچہ پیدا ہونے سے پہلے ایک مکمل خاموشی کا مرحلہ آتا ہے، ویسے ہی نئی خودی کے جنم سے پہلے یہ سکوت ضروری تھا۔

میں نے سیکھا کہ طاقت ہمیشہ آواز میں نہیں ہوتی۔ کبھی کبھی سب سے مضبوط انسان وہ ہوتا ہے جو جواب دے سکتا ہے مگر نہیں دیتا، جو بدلہ لے سکتا ہے مگر چھوڑ دیتا ہے، جو چیخ سکتا ہے مگر مسکرا کر گزر جاتا ہے۔ یہ برداشت

نہیں، یہ اختیار ہے۔ اور اختیار شور سے نہیں، اندرونی سکون سے پیدا ہوتا ہے۔

اب جب میں اپنے سفر کو دیکھتا ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ ٹوٹ جانا ضروری تھا۔ اگر میں نہ ٹوٹتا تو میں نہ رکتا، اگر نہ رکتا تو نہ سوچتا، اگر نہ سوچتا تو نہ بدلتا۔ اور اگر نہ بدلتا تو یہ خاموشی کبھی پیدا نہ ہوتی۔ میں پہلے سمجھتا تھا کہ زندگی میں کچھ پانے کے لیے بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔ اب سمجھ آیا کہ کچھ پانے کے لیے بہت کچھ چھوڑنا پڑتا ہے — خاص طور پر اپنا غرور، اپنی ضد، اپنی انا۔

خاموشی کا جنم میرے اندر ایک نئے آغاز کی علامت ہے۔ میں اب بھی کامل نہیں ہوں، میں اب بھی غلطیاں کروں گا، مگر فرق یہ ہے کہ اب میں اپنے شور کا غلام نہیں ہوں۔ میں اپنے ردِعمل کا مالک ہوں۔ میں نے سیکھ لیا ہے کہ ہر بات کا جواب الفاظ میں نہیں ہوتا، کچھ جواب کردار میں ہوتے ہیں۔

حصہ دوم یہاں مکمل ہوتا ہے۔ یہاں چیخ ختم ہوتی ہے اور سانس شروع ہوتی ہے۔ یہاں دفاع ختم ہوتا ہے اور قبولیت

شروع ہوتی ہے۔ یہاں میں خود سے لڑنا چھوڑ کر خود کے ساتھ چلنا شروع کرتا ہوں۔

اور شاید یہی وہ لمحہ ہے جہاں سے "پا لینا" ممکن ہوتا ہے۔ کیونکہ جب تک انسان کے اندر شور رہتا ہے، وہ کچھ سن نہیں سکتا۔ اور جب خاموشی جنم لے لے تو پھر پہلی بار دل کی اصل آواز سنائی دیتی ہے۔ میں اب خاموش ہوں۔ مگر اس خاموشی میں پہلی بار میں زندہ ہوں۔

حصه سوم: پا لینا

حصہ سوم: پا لینا

باب نہم: خودی کی بیداری

انسان اپنے باطن میں چھپی ہوئی سلطنت کو پہچان لے

میں ڈھونڈتا رہا تھا جہاں بھر میں روشنی،
جو خود میں اتر گیا تو زمانہ بدل گیا۔

سفر کے اس مقام تک پہنچتے پہنچتے انسان بہت کچھ ہار چکا ہوتا ہے مگر اصل میں وہی ہار اس کی سب سے بڑی جیت کی تیاری ہوتی ہے۔ وہ وہم چھوڑ چکا ہوتا ہے، جھوٹی پہچانیں اتار چکا ہوتا ہے، دوسروں کی منظوریاں مانگ مانگ کر تھک چکا ہوتا ہے۔ اب اس کے پاس شور نہیں بچتا، صرف سوال بچتے ہیں، اور یہی سوال خودی کی بیداری کا دروازہ کھولتے ہیں۔

خودی کی بیداری کوئی نعرہ نہیں، کوئی وقتی جذبہ نہیں، بلکہ ایک گہرا داخلی فیصلہ ہے—یہ فیصلہ کہ میں اپنی زندگی کی ذمہ داری قبول کرتا ہوں، میں اپنے زخموں کا حساب بھی خود رکھوں گا اور اپنے خوابوں کی قیمت بھی خود ادا کروں گا۔

ایک وقت تھا جب میں بھیڑ میں اپنی پہچان ڈھونڈتا تھا۔ مجھے لگتا تھا اگر لوگ مجھے سراہیں گے تو میں قیمتی ہو جاؤں گا، اگر لوگ مجھے قبول کر لیں گے تو میں مکمل ہو جاؤں گا۔ مگر سچ یہ تھا کہ میں خود کو قبول نہیں کر رہا تھا۔ میں ردِعمل میں جیتا تھا۔ کوئی کچھ کہتا تو میرا مزاج بدل جاتا، کوئی تعریف کرتا تو میں آسمان پر، کوئی تنقید کرتا تو میں زمین پر۔ میری خوشی کرائے پر تھی اور میرا اعتماد دوسروں کی جیب میں رکھا ہوا تھا۔ یہی وہ کیفیت ہے جس میں انسان زندہ تو ہوتا ہے مگر بااختیار نہیں ہوتا۔

خودی کی بیداری اس لمحے شروع ہوتی ہے جب انسان یہ مان لیتا ہے کہ وہ حالات کا قیدی نہیں۔ حالات اثر انداز ہو سکتے ہیں مگر حتمی فیصلہ اس کے اپنے شعور کا ہوتا ہے۔ وہ سمجھ لیتا ہے کہ وہ صرف جذبات کا مجموعہ نہیں بلکہ ارادے کا مرکز بھی ہے۔ پہلے وہ ہر ناکامی کا الزام وقت، قسمت یا لوگوں پر ڈالتا تھا، اب وہ خود سے سوال کرتا ہے کہ میں نے کیا سیکھا اور کہاں غلط فیصلہ کیا۔ یہی سوال اسے کمزور نہیں بلکہ باوقار بناتے ہیں کیونکہ ذمہ داری قبول کرنا بزدلی نہیں، طاقت کی پہلی سیڑھی ہے۔

مجھے وہ عمر کبھی نہیں بھولتی جب میں سولہ سال کا تھا۔ اندر بے چینی تھی، وسائل محدود تھے، اور ذہن میں موازنوں کا طوفان چلتا رہتا تھا۔ اسکول میں کچھ لڑکے ایسے تھے جن کے پاس سب کچھ بہتر لگتا تھا—لباس، لہجہ، اعتماد۔ میں باہر سے خاموش رہتا مگر اندر ایک آگ جلتی تھی کہ میں کم ہوں۔ ایک دن معمولی سی بات پر مجھے نظر انداز کیا گیا، شاید وہ لمحہ دوسروں کے لیے معمولی تھا مگر میرے لیے فیصلہ کن تھا۔ اسی دن پہلی بار میں نے شدت سے محسوس کیا کہ میں اپنی قیمت دوسروں کی نظروں میں تلاش کر رہا ہوں۔ رات کو دیر تک جاگ کر میں نے خود سے سچ بولا کہ اگر میں نے خود کو قبول نہ کیا تو دنیا کبھی مجھے کافی محسوس نہیں ہو گی۔ میں نے کوئی بڑا اعلان نہیں کیا، بس ایک چھوٹا سا عہد کیا کہ روز ایک قدم بہتر بنوں گا۔ اگلے دن حالات نہیں بدلے مگر میرا زاویہ بدل گیا۔ میں نے پڑھائی پر زیادہ توجہ دی، اپنی کمزوریوں کو لکھا، موازنہ کم کیا، اور ہر دن ایک چھوٹی جیت اپنے نام کی۔ آہستہ آہستہ میں نے محسوس کیا کہ اصل کمی وسائل کی نہیں، یقین کی تھی۔ یہی وہ لمحہ تھا جب خودی کا پہلا چراغ روشن ہوا۔

خودی کی بیداری انسان کو انا پرست نہیں بناتی بلکہ اسے متوازن بناتی ہے۔ اب وہ عزت مانگتا نہیں بلکہ اپنے کردار

سے پیدا کرتا ہے۔ اب وہ ہر مجلس میں اپنی موجودگی ثابت کرنے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ اپنی قدر خود جانتا ہے۔ اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ اصل مقابلہ کسی اور سے نہیں بلکہ اپنے کل سے ہے۔ اگر آج وہ کل سے بہتر ہے تو وہ جیت رہا ہے چاہے دنیا تالیاں نہ بھی بجائے۔ یہ شعور انسان کو اندر سے مضبوط اور باہر سے پُرسکون بنا دیتا ہے۔

اس مرحلے پر خواب دوبارہ زندہ ہوتے ہیں مگر اس بار وہ جذباتی خواہش نہیں رہتے بلکہ سنجیدہ ذمہ داری بن جاتے ہیں۔ پہلے خواب صرف تصور تھے، اب وہ منصوبہ بننے لگتے ہیں۔ پہلے خوف راستہ روکتا تھا، اب خوف صرف ایک امتحان بن جاتا ہے۔ خودی کی بیداری کا مطلب یہ نہیں کہ مشکلات ختم ہو جاتی ہیں بلکہ یہ کہ انسان کا ردِعمل بدل جاتا ہے۔ وہ مسئلہ دیکھ کر گھبرانے کے بجائے سوچنے لگتا ہے، وہ ناکامی کو اپنی شناخت نہیں بناتا بلکہ اسے سبق بنا لیتا ہے۔

یہ بیداری تعلقات کو بھی صاف کر دیتی ہے۔ اب وہ کسی سے اس لیے نہیں جڑتا کہ اسے سہارا چاہیے بلکہ اس لیے جڑتا ہے کہ وہ خود مضبوط ہو کر ساتھ چل سکے۔ وہ محبت میں اپنی پہچان نہیں کھوتا، وہ دوستی میں اپنی حدود نہیں

توڑتا، وہ معافی بھی دیتا ہے مگر اپنی عزت قربان کر کے نہیں۔ اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ جو رشتہ اس کی خودی کو کچل دے وہ رشتہ نہیں، زنجیر ہے۔

خودی کی بیداری انسان کو صبر سکھاتی ہے۔ پہلے وہ جلدی میں تھا، سب کچھ فوراً چاہتا تھا، ہر کامیابی کا شارٹ کٹ ڈھونڈتا تھا۔ اب وہ سمجھ چکا ہے کہ مضبوط عمارت آہستہ بنتی ہے۔ وہ ہر دن کو سرمایہ سمجھتا ہے۔ وہ وقت ضائع کرنے کے بجائے اسے استعمال کرنا سیکھ لیتا ہے۔ وہ جان لیتا ہے کہ مستقل مزاجی وقتی جوش سے زیادہ طاقتور ہوتی ہے۔

"پا لینا" کا اصل مفہوم بھی یہی ہے۔ یہ دنیا کو جیت لینا نہیں بلکہ خود پر اختیار پا لینا ہے۔ جب انسان اپنے جذبات کا غلام نہ رہے، اپنی کمزوریوں سے واقف ہو جائے، اپنے خوف کا سامنا کر لے اور اپنے خواب کی قیمت ادا کرنے کو تیار ہو جائے تو وہ اندر سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اب اگر وہ گرتا بھی ہے تو ٹوٹتا نہیں کیونکہ اسے معلوم ہوتا ہے کہ اٹھنے کی صلاحیت اس کے اندر موجود ہے۔ اس کی طاقت لوگوں کی تائید پر نہیں بلکہ اپنے یقین پر قائم ہوتی ہے۔

میں نے یہ بھی سیکھا کہ خودی کی بیداری کے بعد تنہائی خوفناک نہیں رہتی۔ پہلے میں تنہا ہونے سے ڈرتا تھا کیونکہ میں خود سے ملنے سے ڈرتا تھا۔ اب تنہائی مجھے اپنے خیالات سننے کا موقع دیتی ہے۔ اب میں خود سے بھاگتا نہیں بلکہ خود کے ساتھ بیٹھ سکتا ہوں۔ یہی سکون دراصل اصل طاقت ہے۔

خودی کی بیداری خاموش اعلان ہے کہ میں اپنی زندگی کا ذمہ دار ہوں۔ میں ناکام ہو سکتا ہوں مگر بے وقعت نہیں، میں تنہا ہو سکتا ہوں مگر خالی نہیں، میں گر سکتا ہوں مگر ختم نہیں۔ یہ اعلان زبان سے نہیں کردار سے ہوتا ہے۔ یہ ہر اُس فیصلے میں جھلکتا ہے جہاں انسان آسان راستے کے بجائے درست راستہ چنتا ہے۔

جب خودی بیدار ہو جائے تو انسان کی آنکھوں میں ٹھہراؤ آ جاتا ہے۔ وہ ہر تعریف پر نہیں بہکتا اور ہر تنقید پر نہیں بکھرتا۔ وہ اپنی قدر خود جانتا ہے اور دوسروں کی قدر بھی کرنا سیکھ لیتا ہے۔ اس کے اندر مقابلہ کم اور تعمیر زیادہ ہو جاتی ہے۔ وہ دوسروں کو نیچا دکھا کر نہیں بلکہ خود کو بلند کر کے آگے بڑھتا ہے۔

یہی وہ مقام ہے جہاں "پا لینا" حقیقت بنتا ہے۔ جس نے خود کو پا لیا اس نے سب سے بڑی دولت حاصل کر لی۔ دنیا کی چیزیں بدلتی رہتی ہیں، حالات بدلتے ہیں، لوگ بدلتے ہیں، مگر بیدار خودی انسان کو ثابت قدم رکھتی ہے۔ یہی بیداری اسے اختیار دیتی ہے، یہی اختیار اسے وقار دیتا ہے، اور یہی وقار اسے وہ سکون دیتا ہے جو کسی تعریف، کسی دولت اور کسی ہجوم سے نہیں ملتا۔

یہ باب تکمیل کا اعلان نہیں بلکہ بیداری کا اعتراف ہے۔ میں کامل نہیں ہوا مگر میں جاگ گیا ہوں۔ اور جاگ جانا ہی سب سے بڑی طاقت ہے۔ کیونکہ سویا ہوا انسان خواب دیکھتا ہے مگر جاگا ہوا انسان خواب کی قیمت ادا کرنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ یہی خودی کی بیداری ہے، یہی اصل اختیار ہے، اور یہی وہ دروازہ ہے جہاں سے انسان پہلی بار پورے یقین کے ساتھ کہتا ہے: میں دنیا کو نہیں، خود کو جیتنے نکلا ہوں، اور جب انسان خود کو جیت لے تو اسے کوئی ہرا نہیں سکتا۔

حصہ سوم: پا لینا

باب دہم: اختیار کا اعلان

جب انسان اپنی تقدیر کا قلم خود اپنے ہاتھ میں لے لے

میں نے مقدر کو بھی آئینہ دکھا دیا،

فیصلہ میرا تھا میں نے ہی اسے لکھ دیا۔

خودی کی بیداری کے بعد اگلا قدم سب سے فیصلہ کن ہوتا ہےاختیار کا اعلان۔ یہ اعلان زبان سے نہیں کیا جاتا بلکہ رویے سے ثابت کیا جاتا ہے۔ یہ کوئی جذباتی جملہ نہیں بلکہ ایک مستقل طرزِ زندگی ہے۔ جب انسان یہ مان لیتا ہے کہ اس کی زندگی کی سمت کا ذمہ دار وہ خود ہے تو اس کے سوچنے کا زاویہ بدل جاتا ہے، اس کے فیصلوں کی بنیاد بدل جاتی ہے، اس کے لہجے میں ٹھہراؤ آ جاتا ہے۔ وہ شکایت کرنے والے ہجوم سے نکل کر ذمہ داری اٹھانے والوں کی صف میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ یہی وہ لمحہ ہوتا ہے جب انسان اندر سے بالغ ہوتا ہے۔

ہم اکثر تقدیر کو الزام دیتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں حالات سازگار نہیں تھے، وسائل کم تھے، لوگوں نے ساتھ نہیں دیا، قسمت

نے دروازہ بند رکھا۔ مگر اختیار کا اعلان ان تمام جوازوں کو خاموش کر دیتا ہے۔ انسان مان لیتا ہے کہ دروازہ واقعی بند تھا مگر دستک دینا اس کا کام تھا۔ راستہ واقعی دشوار تھا مگر چلنا اس کا انتخاب تھا۔ موقع کم تھا مگر کوشش اس کے اختیار میں تھی۔ یہ مان لینا آسان نہیں ہوتا کیونکہ اس کے بعد بہانے ختم ہو جاتے ہیں۔

یہ مرحلہ ہمت مانگتا ہے کیونکہ اختیار قبول کرنے کا مطلب یہ بھی ہے کہ آپ اپنی ناکامیوں کی ذمہ داری قبول کریں۔ اب آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ سب قصور دوسروں کا تھا۔ اب آپ کو خود سے پوچھنا پڑتا ہے کہ میں نے کہاں ہچکچاہٹ دکھائی، کہاں خوف کو فیصلہ کرنے دیا، کہاں سچ جانتے ہوئے بھی خاموش رہا۔ یہی سوال انسان کو بے چین کرتے ہیں مگر یہی بے چینی اسے مضبوط بھی بناتی ہے۔ اعتراف کمزوری نہیں بلکہ اختیار کی پہلی شرط ہے۔

مجھے اپنی وہ عمر یاد ہے جب میں سولہ سال کا تھا اور دل میں خواب بہت تھے مگر اعتماد کم تھا۔ گھر کے حالات سادہ تھے، آس پاس کے لوگوں میں موازنہ عام تھا، اور میں اکثر یہ سوچتا تھا کہ شاید میری قسمت محدود ہے۔ ایک بار ایک مقابلے میں حصہ لینے کا موقع ملا مگر میں نے صرف اس

خوف سے نام واپس لے لیا کہ کہیں ناکام نہ ہو جاؤں۔ بعد میں جب نتیجہ آیا تو وہ لڑکا جیت گیا جسے میں خود سے کم سمجھتا تھا۔ اس دن مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ میں قسمت سے نہیں، اپنے خوف سے ہارا تھا۔ وہ رات میرے لیے سخت تھی۔ میں نے خود سے سوال کیا کہ اگر میں نے کوشش ہی نہ کی تو الزام کس کو دوں گا۔ اسی دن میں نے طے کیا کہ آئندہ میں ڈر کی بنیاد پر فیصلہ نہیں کروں گا۔ نتائج میرے حق میں ہوں یا نہ ہوں، انتخاب میرا ہوگا۔ وہ لمحہ شاید دنیا کے لیے معمولی تھا مگر میرے لیے اختیار کے اعلان کی ابتدا تھا۔

اختیار کا اعلان دراصل خود اعتمادی کی تکمیل ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں انسان کہتا ہے کہ میں ڈر کے سائے میں نہیں جینا چاہتا، میں سچ کے ساتھ جینا چاہتا ہوں۔ میں دوسروں کی توقعات کا بوجھ اٹھا کر اپنی شناخت نہیں کھوؤں گا۔ میں اپنے فیصلوں کا مالک ہوں اور ان کے نتائج بھی قبول کروں گا۔ یہ جملہ بولنا آسان ہے مگر اس پر قائم رہنا مشکل ہے۔ کیونکہ جب آپ اپنے فیصلوں کے مالک بنتے ہیں تو آپ کو تنہائی کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ ہر کوئی آپ کی سمت کو نہیں سمجھے گا، ہر کوئی آپ کے انتخاب کی تائید نہیں کرے گا۔ مگر اختیار کا مطلب یہی ہے کہ آپ تعریف کی بنیاد پر نہیں بلکہ یقین کی بنیاد پر چلیں۔

اس اعلان کے بعد زندگی آسان نہیں ہوتی مگر واضح ہو جاتی ہے۔ اب دھند کم ہو جاتی ہے۔ انسان کو معلوم ہوتا ہے کہ اسے کس طرف جانا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ہر قدم اس کا اپنا ہے۔ اگر وہ گرے گا تو اٹھے گا بھی خود، اگر وہ کامیاب ہوگا تو اس کامیابی کی بنیاد اس کی محنت ہوگی۔ وہ انتظار کرنا چھوڑ دیتا ہے کہ کوئی آئے اور اس کی زندگی بدل دے۔ وہ سمجھ جاتا ہے کہ تبدیلی باہر سے نہیں آتی، اندر سے شروع ہوتی ہے۔

اختیار کا مطلب بغاوت نہیں بلکہ شعور ہے۔ یہ ضد نہیں بلکہ ذمہ داری ہے۔ یہ انا نہیں بلکہ وقار ہے۔ جب انسان اختیار کا اعلان کرتا ہے تو وہ دوسروں کی آزادی کا بھی احترام کرتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ جیسے اسے اپنے فیصلوں کا حق ہے ویسے ہی دوسروں کو بھی ہے۔ وہ کسی کو کنٹرول کرنے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ خود کو منظم کرنے پر توجہ دیتا ہے۔ وہ دوسروں کی رائے سنتا ہے مگر اپنی سمت خود طے کرتا ہے۔ یہی توازن اسے پختہ بناتا ہے۔

اختیار کا اعلان انسان کے اندر نظم پیدا کرتا ہے۔ اب وہ وقت کو ضائع نہیں کرتا کیونکہ اسے معلوم ہے کہ ہر لمحہ اس

کے فیصلوں کا حصہ بنے گا۔ وہ بہانوں کو جگہ نہیں دیتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ بہانے وقتی سکون دیتے ہیں مگر مستقل پچھتاوا چھوڑ جاتے ہیں۔ وہ مستقل مزاجی کو اپنا ہتھیار بنا لیتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہے مگر مسلسل اٹھاتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ بڑی تبدیلی ایک ہی دن میں نہیں آتی بلکہ روزانہ کے فیصلوں سے بنتی ہے۔

"تلاشِ وجود" کے سفر میں یہ باب ایک واضح موڑ ہے۔ یہاں انسان محض جاننے سے آگے بڑھ کر کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ اب وہ صرف سوچتا نہیں بلکہ عمل کرتا ہے۔ اب وہ صرف خواب نہیں دیکھتا بلکہ تعبیر کے لیے قیمت ادا کرتا ہے۔ وہ سمجھ جاتا ہے کہ خواب دیکھنا خوبصورت ہے مگر خواب کی حفاظت کرنا اور اس کے لیے محنت کرنا اصل امتحان ہے۔ اختیار کا اعلان اسی امتحان کو قبول کرنے کا نام ہے۔

اس مرحلے پر انسان اپنے خوف سے نظریں ملاتا ہے۔ وہ مانتا ہے کہ اسے ناکامی سے ڈر لگتا ہے، تنہائی سے خوف آتا ہے، تنقید چبھتی ہے، مگر وہ ان احساسات کو فیصلہ کرنے نہیں دیتا۔ وہ انہیں تسلیم کرتا ہے مگر ان کے باوجود قدم اٹھاتا ہے۔ یہی جرات اسے عام لوگوں سے مختلف کرتی

ہے۔ عام لوگ حالات کے مطابق ڈھل جاتے ہیں، بااختیار لوگ حالات کو اپنے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اختیار کا اعلان انسان کو اندرونی سکون بھی دیتا ہے۔ کیونکہ جب آپ جانتے ہیں کہ آپ نے فیصلہ شعور سے کیا ہے تو نتیجہ کچھ بھی ہو آپ کے اندر پچھتاوا کم ہوتا ہے۔ آپ خود سے لڑتے نہیں بلکہ سیکھتے ہیں۔ آپ ہر تجربے کو سرمایہ سمجھتے ہیں۔ یہی سکون اصل کامیابی ہے۔ کامیابی صرف منزل تک پہنچنے کا نام نہیں بلکہ راستے میں خود کو برقرار رکھنے کا نام بھی ہے۔

یہ اعلان انسان کو مضبوط بناتا ہے مگر سخت نہیں بناتا۔ وہ نرم دل رہتا ہے مگر کمزور نہیں ہوتا۔ وہ معاف کر سکتا ہے مگر اپنی حدود بھی قائم رکھتا ہے۔ وہ محبت کر سکتا ہے مگر اپنی شناخت قربان نہیں کرتا۔ کیونکہ اب وہ جانتا ہے کہ اختیار کا مطلب اپنے آپ کی حفاظت بھی ہے۔

جب انسان اپنی تقدیر کا قلم اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے تو وہ قسمت کا انکار نہیں کرتا بلکہ اس کے ساتھ تعاون کرنا سیکھتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ کچھ چیزیں اس کے اختیار

میں نہیں مگر اس کا ردِعمل ہمیشہ اس کے اختیار میں ہے۔ یہی ردِعمل اس کی اصل طاقت ہے۔ وہ حالات کو جواز نہیں بناتا بلکہ انہیں سیڑھی بناتا ہے۔

اختیار کا اعلان دراصل اس بات کی گواہی ہے کہ انسان نے خود کو پا لیا ہے۔ اب وہ کسی اور کے سائے میں نہیں جیتا۔ اب وہ اپنی روشنی میں چلتا ہے۔ اور یہی روشنی اسے منزل کے قریب لے جاتی ہے۔ یہ منزل کوئی بیرونی مقام نہیں بلکہ اندرونی استحکام ہے۔ جب انسان یہ کہہ سکے کہ میں نے اپنی زندگی کا فیصلہ شعور سے کیا، میں نے خوف کے بجائے یقین کو چنا، میں نے بہانے کے بجائے کوشش کو ترجیح دی، تب وہ حقیقت میں بااختیار ہو جاتا ہے۔

یہ باب انجام نہیں بلکہ اعلان ہے۔ اعلان اس بات کا کہ میں اپنی کہانی کا مصنف ہوں۔ اگر صفحہ خالی ہے تو میں لکھوں گا، اگر سطر غلط ہے تو میں درست کروں گا، اگر باب ادھورا ہے تو میں مکمل کروں گا۔ اب میں انتظار نہیں کروں گا کہ کوئی اور آئے اور میری زندگی کی سمت طے کرے۔ میں خود اپنی تقدیر کے قلم کو تھام کر آگے بڑھوں گا۔ یہی اختیار کا اعلان ہے، یہی پا لینے کی تکمیل ہے، اور یہی وہ

مقام ہے جہاں انسان پورے یقین سے کہتا ہے کہ میں حالات کا نتیجہ نہیں بلکہ اپنے فیصلوں کا اظہار ہوں۔

حصہ سوم: پا لینا

باب یازدہم: عہدِ استقامت

جب اعلان کے بعد بھی قدم نہ ڈگمگائیں

میں نے جو ٹھان لیا تو وقت بھی رک نہ سکا
میں جلتا رہا چراغ کی طرح مگر جھک نہ سکا۔

اختیار کا اعلان ایک لمحہ ہوتا ہے، عہدِ استقامت ایک عمر کا امتحان۔ اعلان کرتے وقت انسان کے اندر جوش ہوتا ہے، آنکھوں میں چمک ہوتی ہے، دل میں یقین کی حرارت ہوتی ہے، مگر وقت کا کام صرف سننا نہیں، آزمانا بھی ہے۔ جب جذبات کی شدت کم ہو جاتی ہے اور روزمرہ کی سختی سامنے آتی ہے تب پتا چلتا ہے کہ اعلان کتنا سچا تھا۔ عہدِ استقامت وہ مقام ہے جہاں انسان خود سے کیا گیا وعدہ نبھاتا ہے، چاہے دنیا اس کی رفتار کو سست سمجھے یا اس کی خاموشی کو کمزوری۔ یہی وہ مرحلہ ہے جہاں شخصیت کا اصل وزن سامنے آتا ہے۔

استقامت کا مطلب یہ نہیں کہ راستہ آسان ہو جاتا ہے بلکہ یہ کہ راستہ مشکل ہونے کے باوجود قدم رکتے نہیں۔ انسان جب

اپنی تقدیر کا قلم تھام لیتا ہے تو وقت اسے بار بار پرکھتا ہے۔ کبھی نتائج دیر سے آتے ہیں، کبھی محنت کا صلہ نظر نہیں آتا، کبھی وہی پرانے خوف واپس لوٹ آتے ہیں جو اختیار کے اعلان سے پہلے اسے روکتے تھے۔ اسی مرحلے پر اکثر لوگ تھک جاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں شاید فیصلہ غلط تھا، شاید خواب بہت بڑا تھا، شاید میں اس قابل نہیں۔ مگر عہدِ استقامت یہی ہے کہ شاید کے باوجود قدم نہ ہٹے، شک کے باوجود عمل جاری رہے، تھکن کے باوجود سمت نہ بدلے۔

میں نے بھی یہ مرحلہ جیا ہے۔ اعلان کے بعد سب کچھ بدل نہیں جاتا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ میں نے پورے یقین سے ایک راستہ چنا مگر مہینوں تک کوئی واضح نتیجہ سامنے نہ آیا۔ اندر ایک آواز کہتی تھی کہ رک جاؤ، کوئی آسان راستہ اختیار کر لو، دوسروں کی طرح سمجھوتہ کر لو۔ مگر ہر بار میں نے خود سے وہی سوال کیا جو سولہ سال کی عمر میں کیا تھا: اگر آج میں پیچھے ہٹ گیا تو کل آئینے میں کس نظر سے دیکھوں گا؟ یہ سوال میرا محافظ بن گیا۔ میں نے سیکھا کہ استقامت جذبات سے نہیں، اصول سے پیدا ہوتی ہے۔ جب انسان اپنے اصول واضح کر لے تو وقتی مایوسی اسے ہلا نہیں سکتی۔ اصول وہ لنگر ہیں جو کشتی کو طوفان میں بھی بہنے نہیں دیتے۔

عہدِ استقامت دراصل اپنے ہی اعلان کی حفاظت کرنا ہے۔ اختیار کا اعلان ایک دروازہ کھولتا ہے مگر استقامت اس دروازے سے گزر کر مسلسل چلنے کا نام ہے۔ یہاں تعریف کم ملتی ہے، تنقید زیادہ سنائی دیتی ہے، اور تنہائی گہری ہو جاتی ہے۔ کیونکہ ہر کوئی لمبے سفر کا مسافر نہیں ہوتا۔ کچھ لوگ آغاز میں ساتھ ہوتے ہیں مگر راستے کی دھول دیکھ کر لوٹ جاتے ہیں۔ جو باقی رہتا ہے وہ انسان اور اس کا عہد ہوتا ہے۔ اسی تنہائی میں کردار پکتا ہے، اسی خاموشی میں ارادہ مضبوط ہوتا ہے۔

استقامت کا سب سے بڑا امتحان تاخیر ہے۔ جب خواب کی تعبیر دیر سے ملے تو دل بے چین ہو جاتا ہے۔ انسان سوچتا ہے شاید میری محنت ناکافی ہے، شاید قسمت راضی نہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ بڑی چیزیں وقت مانگتی ہیں۔ بیج کو درخت بننے میں مہینے نہیں، برس لگتے ہیں۔ اگر بیج مٹی کے دباؤ سے گھبرا کر پھٹنے سے انکار کر دے تو وہ کبھی تناور درخت نہیں بن سکتا۔ اسی طرح انسان اگر مشکل کے دباؤ سے پیچھے ہٹ جائے تو وہ اپنی اصل طاقت تک نہیں پہنچ پاتا۔ تاخیر اکثر انعام سے پہلے کی تربیت ہوتی ہے۔

مجھے یاد ہے ایک دور ایسا بھی آیا جب مسلسل ناکامیوں نے میرے اعتماد کو ہلانا شروع کر دیا۔ میں نے محنت کی، منصوبہ بنایا، قدم اٹھائے مگر نتائج بار بار توقع کے خلاف آئے۔ ایک رات میں واقعی تھک گیا۔ دل چاہا سب چھوڑ دوں۔ اسی لمحے مجھے اپنا اعلان یاد آیا۔ میں نے کہا تھا کہ میں فیصلوں کا مالک ہوں اور نتائج قبول کروں گا۔ اگر نتائج میرے خلاف ہیں تو بھی میں اپنے راستے کا انکار نہیں کروں گا۔ میں نے اگلے دن پھر وہی کام کیا مگر اس بار شکایت کے بغیر۔ آہستہ آہستہ میں نے محسوس کیا کہ نتیجہ پہلے نہیں بدلا، میں بدلا ہوں۔ میرا صبر بڑھ گیا، میری برداشت وسیع ہو گئی، میرا یقین گہرا ہو گیا۔ یہی استقامت کا پہلا انعام تھا۔

عہدِ استقامت انسان کو اندر سے مضبوط مگر باہر سے متوازن بناتا ہے۔ وہ شور نہیں کرتا مگر مسلسل کام کرتا ہے۔ وہ ہر ناکامی کو ذاتی تذلیل نہیں سمجھتا بلکہ تربیت سمجھتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ راستہ لمبا ہے تو رفتار متوازن رکھنی ہوگی۔ وہ وقتی جذبات پر انحصار نہیں کرتا بلکہ نظم پیدا کرتا ہے۔ روزانہ تھوڑا سا آگے بڑھنا، روزانہ ایک قدم بہتر ہونا، یہی اس کی حکمت بن جاتی ہے۔ مستقل مزاجی وہ طاقت ہے جو خاموشی سے پہاڑ کاٹ دیتی ہے۔

یہ باب طاقت کا نہیں، ثبات کا ہے۔ طاقت بعض اوقات وقتی ہوتی ہے مگر ثبات دیرپا ہوتا ہے۔ طاقت شور کرتی ہے، ثبات خاموش رہتا ہے۔ طاقت متاثر کرتی ہے، ثبات تعمیر کرتا ہے۔ جو شخص استقامت سیکھ لے وہ وقتی ہار سے نہیں ٹوٹتا۔ وہ جانتا ہے کہ ہر دن کی محنت نظر نہیں آتی مگر ضائع بھی نہیں جاتی۔ وقت گواہی دیتا ہے کہ مسلسل قدم بالآخر منزل تک پہنچاتے ہیں۔

استقامت کا ایک اور پہلو تنہائی ہے۔ جب انسان اپنے اصولوں پر قائم رہتا ہے تو اکثر اسے سمجھا نہیں جاتا۔ لوگ کہتے ہیں اتنی سختی کیوں، اتنا صبر کیوں، اتنی محنت کیوں۔ مگر وہ جانتا ہے کہ یہ سختی نہیں، سرمایہ کاری ہے۔ وہ وقتی سکون کے بدلے مستقل وقار کو چنتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اگر آج وہ آسان راستہ اختیار کرے گا تو کل اسے اپنی نظر میں کمی محسوس ہوگی۔ عزت ہمیشہ آسان راستوں پر نہیں ملتی، وہ ان راستوں پر ملتی ہے جہاں انسان خود کو دھوکہ نہیں دیتا۔

عہدِ استقامت میں انسان اپنے خوف سے دوستی نہیں کرتا مگر اس کے وجود کو تسلیم کرتا ہے۔ خوف واپس آتا ہے، شک دوبارہ جنم لیتا ہے، ماضی کی ناکامیاں ذہن میں گونجتی

ہیں، مگر وہ ان سب کے باوجود چلتا رہتا ہے۔ یہی اصل شجاعت ہے۔ شجاعت خوف کا نہ ہونا نہیں بلکہ خوف کے باوجود قدم اٹھانا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اگر وہ ہر بار ڈر کے مطابق فیصلہ کرے گا تو کبھی اپنے عہد کے مطابق نہیں جی سکے گا۔

"پا لینا" کے سفر میں یہ باب سب سے کڑا ہے کیونکہ یہاں انسان کو فوری تسلی نہیں ملتی۔ یہاں اسے اندرونی طاقت پر بھروسا کرنا پڑتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس کا اعلان صرف اس کی زبان کا وعدہ نہیں بلکہ اس کی روح کا عہد ہے۔ اور روح کے عہد وقتی کمزوری سے نہیں ٹوٹتے۔ روح وہ چراغ ہے جو آندھی میں بھی جلتا رہتا ہے۔

استقامت انسان کو نتیجے سے زیادہ عمل پر مرکوز کر دیتی ہے۔ وہ سیکھ لیتا ہے کہ کامیابی ایک دن کا واقعہ نہیں بلکہ ہزار دن کی مستقل مزاجی کا حاصل ہے۔ وہ ہر صبح نئے جذبے کا انتظار نہیں کرتا بلکہ اپنے عہد کی یاد سے اٹھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ جذبہ کم ہو سکتا ہے مگر عہد برقرار رہنا چاہیے۔ وہ اپنی کمزوریوں کو پہچانتا ہے مگر انہیں جواز نہیں بناتا۔

وقت کے ساتھ ساتھ وہ دیکھتا ہے کہ جن لوگوں نے ابتدا میں اس کا مذاق اڑایا تھا وہی اب اس کے تسلسل کو تسلیم کر رہے ہیں۔ مگر اب اسے تعریف کی ضرورت نہیں رہتی۔ کیونکہ استقامت نے اسے اندر سے مطمئن کر دیا ہے۔ اب اس کی خوشی نتائج سے کم اور وفاداری سے زیادہ جڑی ہوتی ہے۔ وہ اپنے فیصلے کا وفادار رہتا ہے، چاہے دنیا اس کی رفتار کو سست سمجھے۔

جب انسان اس مرحلے کو عبور کر لیتا ہے تو اس کے اندر ایک عجیب سا سکون پیدا ہوتا ہے۔ اب وہ جلدی میں نہیں رہتا۔ اسے معلوم ہے کہ جو چیز اس کے لیے ہے وہ وقت پر ملے گی، مگر اس وقت تک اسے چلتے رہنا ہے۔ وہ اپنے راستے پر قائم رہ کر وقت کو گواہ بنا دیتا ہے۔ وقت آخرکار اسی کے حق میں فیصلہ دیتا ہے جو اس کے ساتھ ثابت قدم رہا ہو۔

عہدِ استقامت دراصل اس بات کا ثبوت ہے کہ اختیار کا اعلان سچا تھا۔ اگر اعلان کے بعد انسان پہلی مشکل پر ٹوٹ جائے تو وہ اعلان محض جذبات تھا۔ مگر اگر وہ مشکل کے باوجود قائم رہے تو وہ اعلان کردار بن جاتا ہے۔ کردار وہی ہے جو دباؤ میں بھی اپنی شکل نہ بدلے، جو فائدے اور نقصان دونوں

میں ایک سا رہے، جو تعریف اور تنقید دونوں میں متوازن رہے۔

یہ باب اختتام نہیں بلکہ پختگی ہے۔ یہاں انسان کو معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ وقتی جوش کا مسافر نہیں بلکہ مستقل عزم کا ساتھی ہے۔ وہ جان لیتا ہے کہ خواب کی قیمت صرف محنت نہیں بلکہ صبر بھی ہے۔ اور جب وہ صبر ادا کر دیتا ہے تو خواب اس کے قریب آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ خواب ان کے ہوتے ہیں جو ان کے لیے ٹھہر سکتے ہیں۔

آخرکار استقامت انسان کو وہ بنا دیتی ہے جو وہ ابتدا میں بننا چاہتا تھا مگر تیار نہیں تھا۔ اب وہ تیار ہے۔ اب وہ مضبوط ہے۔ اب وہ جانتا ہے کہ وقت کی آزمائش اسے جھکا نہیں سکتی۔ وہ شاید آہستہ چلے مگر رکے گا نہیں۔ وہ تھکے گا مگر ہار نہیں مانے گا۔ وہ گرے گا مگر اٹھ کر پھر چلے گا۔

عہدِ استقامت یہی ہے کہ میں نے جو فیصلہ شعور سے کیا تھا، میں اس پر وقت کی دھول نہیں جمنے دوں گا۔ میں نے جو راستہ چنا تھا، میں اسے مشکل دیکھ کر نہیں چھوڑوں گا۔ میں نے جو خواب دیکھا تھا، میں اسے تاخیر کی وجہ

سے دفن نہیں کروں گا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ پا لینا صرف اعلان سے نہیں، قائم رہنے سے ملتا ہے۔ اور جب انسان قائم رہنا سیکھ لے تو وقت بھی اس کے عزم کے سامنے جھک جاتا ہے، اور تاریخ گواہ بن جاتی ہے کہ وہ شخص جو رکا نہیں، وہی آخرکار پہنچا۔

حصہ سوم: پا لینا
باب دوازدہم: فنا سے بقا تک
جب انسان خود سے آگے نکل جائے

میں نے خود کو جلا دیا تو روشنی بڑھ گئی

میں مٹا تو میری پہچان اور گہری ہو گئی

"پا لینا" کا آخری درجہ خود میں سمٹ جانا نہیں، خود سے آگے نکل جانا ہے۔ ابتدا میں انسان خود کو ڈھونڈتا ہے، پھر خود کو سنوارتا ہے، پھر اختیار کا اعلان کرتا ہے، پھر استقامت سے اپنے فیصلے کی حفاظت کرتا ہے، مگر سفر کی تکمیل اس وقت ہوتی ہے جب وہ اپنی انا کی دیوار گرا دیتا ہے۔ فنا سے بقا تک کا سفر یہی ہے کہ انسان اپنی محدود ذات سے نکل کر ایک وسیع تر شعور میں داخل ہو جائے۔ وہ صرف اپنی کامیابی کا مسافر نہ رہے بلکہ اثر بن جائے۔

فنا کا مطلب ختم ہو جانا نہیں بلکہ غلط فہمیوں کا ٹوٹ جانا ہے۔ وہ غلط فہمیاں جو انسان کو یہ یقین دلاتی ہیں کہ سب کچھ اس کے گرد گھومتا ہے، کہ اس کی تکلیف سب سے بڑی ہے، کہ اس کی خواہش ہی مرکز ہے۔ جب وہ اس مرکزیت کو

توڑ دیتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ زندگی صرف اس کی ذات کا نام نہیں بلکہ ایک وسیع دائرہ ہے جس میں دوسرے لوگ بھی شامل ہیں۔ اسی لمحے اس کے اندر ایک نیا توازن پیدا ہوتا ہے۔

میں نے محسوس کیا کہ جب تک میں اپنی کامیابی کو ثابت کرنے میں مصروف رہا تب تک بے چینی میرا سایہ رہی۔ میں ہر کامیابی کے بعد بھی مطمئن نہیں ہوتا تھا کیونکہ اندر کہیں نہ کہیں مقابلہ جاری تھا۔ ایک وقت آیا جب میں نے خود سے سوال کیا کہ آخر میں کس سے جیتنا چاہتا ہوں؟ دنیا سے یا اپنے خوف سے؟ اسی سوال نے میرے اندر ایک خاموش انقلاب برپا کیا۔ میں نے جانا کہ اصل جنگ انا سے ہے۔ جب تک میں اپنی برتری ثابت کرنے میں لگا رہوں گا تب تک سکون دور رہے گا۔ اسی دن میں نے فیصلہ کیا کہ میں ثابت کرنے کے بجائے بہتر بننے پر توجہ دوں گا۔ یہ پہلا قدم تھا فنا کی طرف۔

فنا کا مطلب یہ بھی ہے کہ انسان اپنی کمزوریوں کو چھپانا چھوڑ دے۔ وہ مان لے کہ وہ مکمل نہیں، کہ اس سے غلطی ہو سکتی ہے، کہ وہ سیکھنے کا محتاج ہے۔ جب وہ اپنی

خامیوں کو تسلیم کر لیتا ہے تو اس کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ وہ دفاعی انداز چھوڑ دیتا ہے، وہ ہر تنقید کو حملہ نہیں سمجھتا، وہ ہر اختلاف کو دشمنی نہیں کہتا۔ اس کے اندر برداشت پیدا ہوتی ہے۔ یہی برداشت بقا کی بنیاد ہے۔

مجھے اپنی زندگی کا وہ دور یاد ہے جب میں نے ایک بڑی کامیابی حاصل کی۔ لوگ تعریف کر رہے تھے، نام لیا جا رہا تھا، مگر عجیب بات یہ تھی کہ اندر سکون نہیں تھا۔ میں نے سوچا شاید اگلی کامیابی سکون دے گی، مگر اگلی کے بعد بھی وہی خلا رہا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ مسئلہ کامیابی کی کمی نہیں بلکہ نیت کی سمت ہے۔ میں خود کو ثابت کرنا چاہتا تھا، خود کو بڑا دکھانا چاہتا تھا، اور یہی انا مجھے تھکا رہی تھی۔ جب میں نے یہ تسلیم کیا تو اندر ایک نرم سی روشنی پیدا ہوئی۔ میں نے پہلی بار کسی کام کو صرف اس لیے کیا کہ وہ درست تھا، نہ کہ اس لیے کہ لوگ دیکھیں گے۔ وہ دن میرے لیے فنا کا آغاز تھا۔

فنا سے بقا تک کا سفر خاموش ہوتا ہے۔ اس میں کوئی اعلان نہیں ہوتا، کوئی شور نہیں ہوتا۔ انسان آہستہ آہستہ بدلتا ہے۔ وہ اپنی بات کم اور اپنے عمل زیادہ نمایاں کرتا ہے۔ وہ اپنی

کامیابیوں کا چرچا نہیں کرتا بلکہ دوسروں کو آگے بڑھانے میں خوشی محسوس کرتا ہے۔ وہ سمجھ جاتا ہے کہ اصل اثر وہ ہے جو دوسروں کی زندگی میں بہتری لائے۔

بقا کا مطلب جسمانی وجود نہیں بلکہ فکری اور اخلاقی اثر ہے۔ جب انسان اپنی انا کو کم کر دیتا ہے تو اس کا اثر بڑھ جاتا ہے۔ لوگ اس کے لفظوں سے زیادہ اس کے کردار کو محسوس کرتے ہیں۔ وہ مشورہ دیتا ہے تو اس میں تکبر نہیں ہوتا، وہ تنبیہ کرتا ہے تو اس میں حقارت نہیں ہوتی، وہ محبت کرتا ہے تو اس میں ملکیت نہیں ہوتی۔ یہی وسعت اسے باقی رکھتی ہے۔

فنا کا ایک پہلو معافی بھی ہے۔ جب تک انسان اپنی انا کے ساتھ جڑا رہتا ہے وہ معاف نہیں کر پاتا۔ اسے ہر بات ذاتی لگتی ہے۔ مگر جب وہ خود سے آگے نکل جاتا ہے تو اسے سمجھ آتی ہے کہ ہر انسان اپنی جنگ لڑ رہا ہے۔ وہ دل میں جمع کینہ چھوڑ دیتا ہے۔ یہ چھوڑ دینا کمزوری نہیں بلکہ آزادی ہے۔ جس دن میں نے کچھ پرانے شکوے دل سے نکالے اسی دن مجھے احساس ہوا کہ میں ہلکا ہو گیا ہوں۔ میں نے کسی اور کو نہیں، خود کو آزاد کیا تھا۔

بقا کا مطلب یہ نہیں کہ انسان دنیا سے کنارہ کش ہو جائے۔ بلکہ وہ دنیا میں رہ کر بھی اپنے مرکز کو وسیع کر دیتا ہے۔ وہ کامیابی حاصل کرتا ہے مگر اس کا اسیر نہیں بنتا۔ وہ دولت کماتا ہے مگر اس کی غلامی نہیں کرتا۔ وہ مقام پاتا ہے مگر اسے اپنی پہچان نہیں بناتا۔ اس کی پہچان اس کا کردار بن جاتا ہے۔

ایک وقت ایسا بھی آیا جب مجھے لگا کہ میں بہت آگے آ چکا ہوں۔ میں نے خود پر فخر محسوس کیا۔ مگر اسی لمحے زندگی نے مجھے ایک چھوٹا سا امتحان دیا۔ ایک معمولی سی ناکامی نے میرے اندر چھپی ہوئی بے چینی کو دوبارہ جگا دیا۔ تب میں نے سمجھا کہ انا بہت باریک شکلوں میں واپس آ جاتی ہے۔ وہ کبھی غرور بن کر، کبھی حساسیت بن کر، کبھی حق بجانب ہونے کے احساس میں چھپ کر آتی ہے۔ فنا ایک دفعہ کا عمل نہیں، مسلسل نگرانی کا نام ہے۔ انسان کو بار بار اپنے ارادوں کو پرکھنا پڑتا ہے۔

میں نے سیکھا کہ خاموش خدمت انا کو کمزور کرتی ہے۔ جب آپ کسی کی مدد کریں اور اس کا ذکر بھی نہ کریں تو اندر ایک عجیب سی پاکیزگی پیدا ہوتی ہے۔ وہ پاکیزگی بقا کی

خوشبو ہے۔ وہ انسان کو اندر سے مضبوط کرتی ہے کیونکہ اب اس کی خوشی دوسروں کی آنکھوں میں چمک دیکھنے سے جڑی ہوتی ہے، نہ کہ اپنی تعریف سننے سے۔

فنا سے بقا تک زاویہ بدل جاتا ہے۔ پہلے میں سوچتا تھا کہ میں کتنا حاصل کر سکتا ہوں، اب میں سوچتا ہوں کہ میں کتنا بانٹ سکتا ہوں۔ پہلے میں ہر کامیابی کو اپنی محنت کا نتیجہ سمجھتا تھا، اب میں مانتا ہوں کہ اس میں وقت، حالات، اساتذہ، دوستوں اور دعاؤں کا حصہ بھی شامل ہے۔ یہ اعتراف انسان کو چھوٹا نہیں کرتا بلکہ بڑا بنا دیتا ہے۔ کیونکہ جو جھک سکتا ہے وہی اصل میں بلند ہوتا ہے۔

میں نے اپنے تعلقات میں بھی یہ تبدیلی محسوس کی۔ جب میں نے جیتنے کی ضد چھوڑ دی تو سننا شروع کیا۔ جب میں نے اپنی بات منوانے کی کوشش کم کی تو سمجھنا شروع کیا۔ جب میں نے ہر اختلاف کو چیلنج سمجھنا چھوڑا تو رشتے نرم ہونے لگے۔ میں نے جانا کہ انا صرف انسان کو تنہا کرتی ہے، جبکہ عاجزی اسے جوڑتی ہے۔

بقا کا ایک اور پہلو مقصد ہے۔ جب انسان اپنی ذات سے آگے نکلتا ہے تو اسے ایک وسیع مقصد دکھائی دیتا ہے۔ وہ اپنے کام کو صرف روزگار نہیں سمجھتا بلکہ خدمت سمجھتا ہے۔ وہ اپنی تحریر کو صرف الفاظ نہیں سمجھتا بلکہ ذمہ داری سمجھتا ہے۔ وہ اپنی آواز کو صرف اظہار نہیں سمجھتا بلکہ امانت سمجھتا ہے۔ یہی شعور اسے باقی رکھتا ہے۔

"پا لینا" کے سفر کی تکمیل اسی مقام پر ہوتی ہے جہاں انسان اپنی کامیابی کو اپنی ذات کی دیوار میں قید نہیں کرتا بلکہ اسے دوسروں کے لیے راستہ بنا دیتا ہے۔ وہ اپنی کہانی کو مثال نہیں بناتا بلکہ وسیلہ بناتا ہے۔ وہ اپنی تکلیف کو شکایت نہیں بناتا بلکہ ہمدردی میں بدل دیتا ہے۔

فنا سے بقا تک انسان کے اندر ایک گہرا سکون پیدا ہوتا ہے۔ اب وہ مقابلے میں نہیں جیتا، وہ معنی میں جیتا ہے۔ اب وہ جلدی میں نہیں رہتا، وہ گہرائی میں رہتا ہے۔ اب وہ ثابت نہیں کرتا، وہ ثابت قدم رہتا ہے۔ یہ سکون کسی تمغے کا محتاج نہیں ہوتا۔ یہ اندر کی ہم آہنگی کا نتیجہ ہوتا ہے۔

میں جب پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو محسوس کرتا ہوں کہ اصل تبدیلی اس دن شروع ہوئی تھی جب میں نے خود کو مرکز سمجھنا چھوڑا۔ میں نے اپنی انا کی آواز کو پہچانا اور اسے خاموش کرنا سیکھا۔ میں نے ہر کامیابی کے بعد رک کر خود سے پوچھا کہ کیا میں وسیع ہوا ہوں یا صرف بڑا دکھائی دیا ہوں؟ یہ سوال میری رہنمائی کرتا رہا۔

فنا سے بقا تک کا سفر انسان کو نرم بھی بناتا ہے اور مضبوط بھی۔ نرم اس لیے کہ وہ دوسروں کی تکلیف کو محسوس کرتا ہے، مضبوط اس لیے کہ وہ اپنی انا کے فریب میں نہیں آتا۔ وہ جانتا ہے کہ اصل عظمت سادگی میں ہے، اصل طاقت توازن میں ہے، اصل بقا کردار میں ہے۔

اس باب کا اختتام کامیابی پر نہیں بلکہ تبدیلی پر ہوتا ہے۔ آخری باب میں انسان یہ نہیں کہتا کہ میں کامیاب ہو گیا۔ وہ کہتا ہے: میں بدل گیا۔ کیونکہ کامیابی عارضی ہو سکتی ہے مگر تبدیلی دیرپا ہوتی ہے۔ کامیابی حالات پر منحصر ہے مگر تبدیلی شعور پر۔ جب شعور وسیع ہو جائے تو حالات کی تنگی بھی اسے محدود نہیں کر سکتی۔

حصہ سوم "پا لینا" یہاں مکمل ہوتا ہے، مگر یہ انجام نہیں بلکہ ارتقا ہے۔ اب انسان خود کی تلاش میں نہیں بلکہ خود سے آگے بڑھنے میں مصروف ہے۔ اب وہ زندگی سے صرف لینا نہیں چاہتا بلکہ دینا چاہتا ہے۔ اب وہ کامیابی کا نہیں بلکہ معنی کا مسافر ہے۔

اور جب وہ خاموشی سے آئینے میں دیکھتا ہے تو مسکرا کر کہتا ہے: میں نے دنیا نہیں جیتی، میں نے خود کو وسیع کر لیا۔ میں نے اپنی انا کو جلا کر شعور کی روشنی پیدا کی۔ میں مٹا نہیں، میں پھیل گیا۔ یہی فنا سے بقا تک کا سفر ہے۔ یہی پا لینے کی تکمیل ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں انسان اپنی ذات سے آگے نکل کر اثر بن جاتا ہے، اور اثر کبھی فنا نہیں ہوتا۔

حرفِ آخر — مسافر ابھی زندہ ہے

کتاب بند ہو سکتی ہے، مگر شعور کا سفر کبھی ختم نہیں ہوتا

میں لفظ لفظ میں خود کو تلاش کرتا رہا،

جب خود کو پا لیا تو سفر پھر بھی ساتھ رہا۔

ہر کتاب ایک مقام پر آ کر ختم ہو جاتی ہے، مگر کچھ سوال ایسے ہوتے ہیں جو آخری صفحہ پلٹنے کے بعد شروع ہوتے ہیں۔ "تلاشِ وجود" بھی انہی سوالوں کی کتاب ہے۔ اگر تم نے اسے صرف پڑھا ہے تو یہ کہانی ابھی ادھوری ہے۔ اگر تم نے اسے محسوس کیا ہے تو یہ سفر ابھی جاری ہے۔

یہ تحریر کسی نظریے کی تبلیغ نہیں تھی، نہ کسی مخصوص راستے کی دعوت۔ یہ صرف ایک آئینہ تھا۔ آئینہ کبھی مجبور نہیں کرتا، وہ صرف دکھاتا ہے۔ اب یہ تم پر ہے کہ تم نے اس آئینے میں کیا دیکھا۔ اپنی کمزوری؟ اپنی طاقت؟ اپنا خوف؟ یا اپنی اصل؟

زندگی ہمیشہ واضح نہیں ہوتی۔ کبھی روشنی زیادہ ہوتی ہے، کبھی اندھیرا گہرا۔ مگر فرق اب یہ ہے کہ تم اندھیرے سے گھبراؤ گے نہیں۔ کیونکہ تم جان چکے ہو کہ روشنی باہر سے نہیں آتی، اندر سے جاگتی ہے۔ تم جان چکے ہو کہ شکست ہمیشہ انجام نہیں ہوتی، کبھی کبھی وہی آغاز ہوتی ہے۔

اگر کبھی پھر تم بھیڑ میں کھو جاؤ تو خود کو یاد دلانا کہ تم نے تنہائی میں خود کو پایا تھا۔ اگر کبھی تم پر الزام آئے تو نفس کی عدالت یاد کرنا جہاں تم نے سچ قبول کیا تھا۔ اگر کبھی تم کمزور پڑو تو خودی کی بیداری یاد کرنا جہاں تم نے اپنی طاقت پہچانی تھی۔

یہ کتاب کسی کامل انسان کے لیے نہیں لکھی گئی۔ یہ اس انسان کے لیے لکھی گئی ہے جو سچ بولنے کی ہمت رکھتا ہو، جو اپنی غلطی ماننے کا ظرف رکھتا ہو، جو گر کر اٹھنے کا ارادہ رکھتا ہو۔ اگر تم ایسے ہو تو تم ہی اس کتاب کے اصل مخاطب ہو۔

سفر ابھی ختم نہیں ہوا۔ شاید تم ایک نئے سوال کے دہانے پر کھڑے ہو۔ شاید تمہاری زندگی ایک نئے موڑ پر ہے۔ شاید تمہیں پھر کسی فیصلے کی ضرورت ہے۔ یاد رکھنا، تم اب وہ شخص نہیں رہے جو آغاز میں تھے۔ تم بدل چکے ہو۔ تم نے شعور کی ایک سیڑھی چڑھ لی ہے۔ اور شعور کی سیڑھیاں کبھی واپس نہیں اترتیں۔

اگر اس کتاب نے تمہیں ایک لمحے کے لیے بھی خود سے ملایا ہے، اگر اس نے تمہارے دل میں ایک سوال بھی جگایا ہے، اگر اس نے تمہیں ایک سچ قبول کرنے پر مجبور کیا ہے—تو یہی اس کی کامیابی ہے۔

کتابیں ختم ہو جاتی ہیں۔ مصنف خاموش ہو جاتا ہے۔ مگر مسافر خاموش نہیں ہوتا۔ وہ چلتا رہتا ہے۔ وہ سیکھتا رہتا ہے۔ وہ اپنے اندر روشنی کو زندہ رکھتا ہے۔

تم بھی وہی مسافر ہو۔

تمہارے قدموں میں راستہ ہے۔

تمہارے دل میں سوال ہے۔

اور تمہارے اندر وہ روشنی ہے جو تمہیں کبھی مکمل اندھیرے میں نہیں جانے دے گی۔

یہ حرفِ آخر نہیں...

یہ تمہارے باطن میں لکھی گئی ایک نئی سطر کا آغاز ہے۔

قاری کے نام پیغام

اگر یہ لفظ آپ کے اندر کوئی ہلچل پیدا کر گئے ہیں تو سفر شروع ہو چکا ہے

اگر آپ یہاں تک پہنچ چکے ہیں، تو آپ محض قاری نہیں ایک مسافر ہیں۔ یہ کتاب کسی نتیجے کا اعلان نہیں، ایک سوال کا آغاز ہے۔ میں نے آپ کو جواب نہیں دیے، میں نے صرف آئینہ دیا ہے۔ ممکن ہے کچھ سطریں آپ کو چبھیں، کچھ آپ کو خاموش کر دیں، اور کچھ آپ کو خود سے ملا دیں۔ اگر ایسا ہوا ہے، تو یہ کتاب اپنے مقصد تک پہنچ گئی۔

میں آپ سے صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں:

خود کو سنجیدگی سے لیں۔

اپنے سوالوں سے مت بھاگیں۔

دنیا کی آواز سے پہلے اپنے اندر کی آواز سنیں۔

شاید ہم کبھی نہ ملیں،

لیکن اگر آپ نے خود کو پا لیا تو سمجھئے ہم ہمسفر تھے۔

میں لفظ چھوڑ گیا ہوں تمہارے سفر کے لیے،

جب خود کو پا لو تو یہی میرا صلہ سمجھنا۔

"شـــایـــان جمــــیـــل | خـــودی کـــا مســــــافر"

دعاؤں میں یاد رکھنا

(اللہ حافظ)